کرشن چندر

ہم وحشی ہیں

ہم وحشی ہیں

ہم وحشی ہیں

کرشن چندر

مکتبۂ شعروادب سمن آباد لاہور

ناشر . . . . نواز
مطبع . . . . . .زاہد بشیر پرنٹرز

دو باتیں	کرشن چندر
دیباچہ	سردار جعفری
اندھے	۲۱
لال باغ	۳۰
ایک طوائف کا خط	۴۲
جیکسن	۵۲
امرتسر آزادی سے پہلے	۷۵
امرتسر آزادی کے بعد	۸۳
پشاور ایکسپریس	۱۰۱

دو باتیں

"ہم وحشی ہیں" کے چوتھے ایڈیشن کا دیباچہ تو اب کیا لکھوں گا، ہاں دو ایک باتیں عرض کئے دیتا ہوں جن کا ان کہانیوں سے تعلق ہے اور جو شاید آپ کو معلوم نہ ہوں گی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کہانیاں تقسیم ہند کے سلسلے کے فسادات کے دوران میں لکھی گئیں اور انتہائی غم اور غصہ کے عالم میں لکھی گئیں اور صرف پندرہ دن میں لکھی گئیں۔ اور جس تیزی سے میں لکھتا جاتا تھا اسی تیزی سے یہ کہانیاں اس برصغیر کے رسالوں اور اخبارات میں چھپتی جاتی تھیں۔ یہ وہ موقعہ تھا جب فسادات نئے نئے شروع ہوئے تھے، جب سیاست داں انگشت بدنداں تھے اور کسی کو لب کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ بلکہ شروع کی دو ایک کہانیاں تو مجھے لوٹا دی گئیں، یہ کہہ کر کہ ان کہانیوں میں ہمارے قومی نیتاؤں پر حملہ ہے، لیکن بعد میں، پرچوں اور رسالوں اور اخبارات نے انہیں چھاپا، ممکن ہے کچھ لوگوں کی نظر میں یہ کہانیاں فن برائے فن کے فارمولے پر پوری نہ اترتی ہوں۔ مگر ان کہانیوں نے

ایک نازک موقع پر اپنا فریضہ ضرور ادا کیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس تاریخی فریضے کی ادائیگی میں ملک کے رسالوں اور اخباروں نے بدرجۂ اتم بڑی مدد کی ہے۔ اس برصغیر کی ہر زبان کے اخبارات نے ان کہانیوں کو چھاپا ہے اور انھیں نمایاں طور پر اپنے صفحات میں جگہ دی ہے، ان افسانوں کی اشاعت پر ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی حکومتوں نے کئی اخبارات کو وارننگ بھی دی۔ اور دو ایک کی ضمانتیں بھی ضبط ہوئیں۔ مگر معاملہ ایسا ٹیڑھا تھا، اور افسانے ایسے سچے تھے اور حالات پر اس قدر حاوی تھے کہ اس سے زیادہ ان افسانوں کے خلاف کچھ نہ کیا جا سکا۔ "ہم وحشی ہیں" کتابی صورت میں ہمارے ملک کی بیشتر زبانوں میں کئی ایک ایڈیشنوں میں چھپ چکی ہے۔ بنگالی، گجراتی، مرہٹی، ہندی، تامل، تیلگو، ملیالم اور کرٹکی میں کتابی صورت میں چھپنے کے علاوہ اس کی چند کہانیوں کے تراجم غیر ملکی زبانوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں پشاور ایکسپریس اور جیکسن زیادہ مقبول رہے ہیں۔

لگے ہاتھوں ان افسانوں کے سلسلے میں ایک سچی کہانی بھی سن لیجئے

ان افسانوں میں آپ کو ایک کہانی ملے گی "ایک طوائف کا خط۔ محمد علی جناح اور جواہر لال نہرو کے نام"۔ یہ خط بہت عرصے تک ہندوستان اور پاکستان کے اخبارات اور رسالوں میں چھپتا رہا، انگریزی اور دوسری زبانوں کے علاوہ ایک روز اس کی باری گجراتی میں چھپنے کے لیے بھی آ گئی۔ بمبئی میں اس خط کو ایک خاتون نے شائع کیا۔ نام بھولتا ہوں مگر وہ خاتون آل انڈیا ویمنز کانفرنس کی ممبر ہیں اور اپنا ایک پرچہ بیک وقت گجراتی اور اردو میں شائع کرتی ہیں مجھے معلوم نہیں کہ یہ افسانہ انھوں نے کب اور کس وقت شائع کیا۔ لیکن انھوں نے ازراہ ہمدردی اتنا اہتمام ضرور کیا کہ یہ افسانہ شائع کر کے اس پر

سرخ نشان لگا کر مسٹر کھیر کو بھیج دیا۔ جو ان دنوں بمبئی کے چیف منسٹر تھے۔ اور ان سے استدعا کی وہ جلد از جلد ان دو بدنصیب لڑکیوں کا پتہ چلائیں (جن میں سے ایک ہندو لڑکی تھی بیلا، اور دوسری مسلمان۔ نام بتول) مسٹر کھیر کو غالباً افسانہ پڑھنے کی کہاں فرصت تھی۔ انھوں نے ارجنٹ سلپ لگا کر بمبئی کی پولیس کو بھیج دیا کہ فوراً بیلا اور بتول کو برآمد کیا جائے۔ بس پھر کیا تھا پولیس کی ساری مشنری حرکت میں آگئی اور ایک روز میرے گھر پہونچ کر نکالو، کہاں ہیں دونوں لڑکیاں، میں نے کہا کونسی لڑکیاں، پولیس انسپکٹر گرج کر بولا۔ بدمعاش ہم سے چار سو بیس کرتا ہے۔ بتا کہاں ہیں یہ دونوں لڑکیاں۔ بیلا اور بتول! ورنہ ابھی !

پولیس افسر کے ہاتھ میں یہ افسانہ تھا۔

پہلے تو مجھے ہنسی آئی، مگر پولیس کے حاکم کا سنجیدہ چہرہ بلکہ غضب ناک چہرہ دیکھ کر میں خاموش ہو گیا۔ انتہائی حلم اور انکسار سے میں نے ان سے دریافت کیا کہ وہ میرے گھر تک کیسے پہونچے۔ میں جب ان سے سارا واقعہ سُن چکا تو پھر بھی نہیں ہنسا۔ حالانکہ قہقہہ لگانے کو جی چاہتا تھا بڑی مشکل سے انھیں اپنے پاس بٹھا کر افسانہ سنایا۔ کیونکہ غالباً انھوں نے بھی پوری طرح نہیں پڑھا تھا۔ اور اگر پڑھا تھا تو سمجھا نہیں تھا۔ ورنہ میرے گھر تک کیوں آتے بڑی مشکل سے انھیں میں نے اس بات پر راضی کیا کہ وہ اس افسانہ کو افسانہ ہی سمجھیں۔ فی الحال اور ان دو لڑکیوں کو ڈھونڈنے کا خیال ترک کر دیں۔

تھوڑا سا راضی تو ہوگئے مگر پھر برافروختہ ہو کے بولے۔ مگر یہ — یہ دو لڑکیاں ہیں کہاں بیلا اور بتول!

میں نے کہا۔ ایسی لڑکیاں یوں تو آپ کو بہت سی جگہوں پر مل جائیں گی مگر یہ خاص

دو لڑکیاں تو اس وقت صرف میرے دماغ میں ہیں۔

مگر یہ جگہ جس کا آپ نے افسانے میں ذکر کیا ہے جہاں یہ دو لڑکیاں رہتی ہیں یہ تو آپ کے دماغ کی اختراع نہیں ہے۔ یہ فارس روڈ کی گلی جینی ٹیلر کی دکان۔ یہ سب جگہیں میری خود کی دیکھی ہوئی ہیں۔ میں سب جگہوں سے ہو کے آیا ہوں۔ کہاں ہیں وہ دو لڑکیاں؟ بتائیے، نہیں تو تھانے چلئے۔

میں نے سوچا کہ انھیں حقیقت نگاری، پس منظر کی اور ترقی پسندی ہر ایک پر لکچر دے ڈالوں مگر یہ سوچا کہ یہ سب بے کار جائے گا۔ آخر سوچ کے میں نے ان سے کہا صاحب میں تھانے تو چلتا ہوں مگر ایک بات سوچ لیجئے۔ فرض کیجئے کہ میں ایک قاتل کے بارے میں ایک کہانی لکھتا ہوں۔ اور صیغہ واحد متکلم میں، یعنی میں نے یہ قتل کیا، یوں کیا، ایسے کیا۔ ان حالات میں کیا، تو کیا آپ مجھے پھانسی پر چڑھا دیں گے۔

یہ بات اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آئی، کہنے لگا۔ اچھا تو یہ بالکل من گھڑت کہانی ہے! داستان! جیسے الف لیلہ!

میں نے سر جھکا کے کہا، جی اسے کچھ ایسا ہی سمجھ لیجئے!

پولیس افسر واپس چلا گیا۔ لیکن بالکل مطمئن ہو کر نہیں گیا۔ کیونکہ اس کے بعد جب نیاز چند رگرفتار ہوئے تو تحقیقات کے دوران ان سے بھی پوچھا گیا۔ بھائی وہ بیلا اور بتول کا کیا معاملہ ہے۔ اس وقت کرشن چندر ہمارے آدمی کو ٹال گئے۔ بتایا نہیں۔ تم جانتے ہو... بیلا اور بتول کون ہیں اور فارس روڈ کی کس طوائف کے پاس رہتی ہیں؟

جب پولیس کا ضمیر مطمئن نہیں ہے تو میرا اور آپ کا ضمیر کیسے مطمئن ہو گا۔ کیونکہ یہ سچ ہے کہ بیلا اور بتول افسانوی کردار ہوتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہیں، ممکن ہے

ان کے نام بیلا اور بتول نہ ہوں، کچھ اور نام ہوں، ممکن ہے وہ کسی طوائف کے پاس نہ ہوں کسی شریف آدمی کے پاس ہوں، کسی رئیس کے صاحبزادے کے پاس، کسی نواب زادے کے پاس، کسی اسمبلی کے ممبر کے پاس۔ ہم وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دونوں لڑکیاں کہاں ہیں مگر اس برصغیر میں، اس ہندوستان اور پاکستان میں دونوں طرف آج بھی ایسی ہزاروں بدقسمت بیلا اور بتول اپنی ناشاد اور مجبور زندگیوں کو لیے کھڑی ہیں۔ اس لیے "ہم وحشی ہیں" کے افسانوں کی آج بھی ضرورت باقی ہے!

گو بہت سے لوگوں نے ورق اُلٹ دیا ہے، انھوں نے ماضی پر خاک ڈال دی ہے جیتوں کو مُردوں میں شمار کر لیا ہے۔ اور مطمئن ہو گئے ہیں۔ مگر افسانہ نگار کا ضمیر سیاستداں کے ضمیر سے ذرا مختلف ہوتا ہے!

کرشن چندر

دیباچہ

ہندستان اور پاکستان میں خانہ جنگی کی آگ لگی ہوئی ہے جس کے شعلوں میں انسانوں، مکانوں، اور کتب خانوں کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی، آزادی، تہذیب اور تمدّن کے جل کر خاک ہو جانے کا اندیشہ ہے، آج کئی مہینوں کے بعد یہ شعلے ہلکے پڑ گئے ہیں، لیکن ابھی ٹھنڈے نہیں ہوئے ہیں۔ راکھ کے نیچے بہت سی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں جو ذرا سی پھونک سے بھڑک سکتی ہیں۔ ان کو ہوا دینے والے بھی موجود ہیں۔

لیکن آگ بجھانے والوں کی بھی کمی نہیں، ہندستان اور پاکستان کے صحت مند اور ترقی پسند عناصر اس خانہ جنگی کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کامیابی انھیں کو ہوگی، کیونکہ وقت، تاریخ اور مستقبل انھیں کے ساتھ ہے۔ زندگی کے تقاضے انھیں تقویت پہونچا رہے ہیں، انقلابی قوتیں انھیں سہارا دے رہی ہیں اور انسانیت کی بہترین روایات ان کی پشت پناہی پر ہیں۔

لیکن خانہ جنگی کے خلاف کامیاب جد و جہد اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب

تک اس کی حقیقی نوعیت کا علم نہ ہو، اور آگ لگانے والے ہاتھ پہچان نہ لیے جائیں، جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ آج کی خانہ جنگی ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی نفرت کی لڑائی نہیں ہے بلکہ انقلاب اور آزادی کے نظریے پر انقلاب دشمن لشکر کا حملہ ہے، جسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں کے بیر سے تقویت پہونچ رہی ہے۔ یہ لشکر منظم ہے مسلح ہے۔ اس کے داؤں پیچ بہت سوچ سمجھ کر وضع کیے گئے ہیں۔ دراصل اس حملے کی زد پر پاکستان اور ہندستان کی اقلیتیں نہیں ہیں، اقلیتوں کا تو صرف بہانہ ہے، اصلی حملہ چالیس کروڑ ہندستانی اور پاکستانی عوام پر ہے، اس آزادی پر ہے جو ابھی پچاس سال کی قربانیوں کے بعد بھی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اس قوت پر ہے جو انقلابی تحریک کو چلا رہی ہے اور ان جماعتوں پر ہے جو آزادی کے علم بردار ہیں۔

اس رجعت پرست انقلاب دشمن کو منظم کرنے والے انگریز سامراجی، انگریز فوجی افسر اور انگریز حکام ہیں۔ جو ہندستان و پاکستان میں قومی حکومتیں بن جانے کے بعد بھی نظم و نسق کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں۔ آج ان کی سازش کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ ہر ستمبر کے "پاکستان ٹائمز" میں پنجاب پولیس کے ایک افسر جینکنس کا جو خط شائع ہوا ہے وہ انگریزوں کی سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہے، بعد کے واقعات بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ یاؤنڈری فورس کے کرتوت سے کون واقف نہیں ہے جس نے انگریز افسروں کی رہنمائی میں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر اور مغربی پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں پر گولی چلائی۔ پنجاب کے حاکموں نے فساد کرنے والے گنڈوں کی امداد کی۔ دہلی میں نوکر شاہی نے ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو تک کی پرواہ نہ کی۔ اور مسلم اقلیت کا فرض پورا نہیں کیا۔ دہلی کے ہنگامے کی سازش میں فوجی افسر شامل تھے یہ حال

پاکستان میں ہوا۔

برطانوی سلطنت کا آفتاب جو دو سو برس سے انسانیت کو جھلسا رہا تھا ڈوب چکا ہے۔ ان کی حکومت کی منحوس بساط اُلٹ چکی ہے۔ یورپ میں ان کا اقتدار ختم ہو گیا ہے ایشیا میں آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ ان کی سانس کا ڈور ہندوستان میں ٹوٹ رہا ہے۔ فرنگی چال بازوں نے اپنے آپ کو بچانے کی نئی ترکیب سوچی۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ اب ہندوستان پر اپنی فوجی طاقت سے حکومت نہیں کر سکتے۔ اس لیے انھوں نے ہماری شاندار تحریک آزادی کی بعض کمزوریوں اور خصوصیت کے ساتھ ہندو مسلم نفاق سے فائدہ اٹھایا جو انگریزی سیاست کے علاوہ ہماری قومی قیادت کی سرمایہ دارانہ ذہنیتوں سے پیدا ہوا تھا اور کہا کہ ہم پر امن طریقے سے اقتدار منتقل کر دیں گے۔ اس طرح انھوں نے اپنے آپ کو عوامی قوت کے آخری وار سے محفوظ کر لیا۔ ان کے ساتھ ہندوستان کے رجعت پرست عناصر بھی محفوظ ہو گئے جنھیں خود فرنگیوں نے جنم دیا تھا۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ ساتھ انھوں نے فوجوں کو بھی مذہبی بنیاد پر تقسیم کر دیا اور اپنے گرگوں اور کتوں کو دیسی رجواڑوں کی شکل میں آزاد کر دیا ان کے گلوں سے پٹے اتار دیے گئے اور زنجیریں کھول دی گئیں، ہندو دوں مسلمانوں اور سکھوں کو بھڑکانے کے لیے انگریز کو رشاہی موجود ہی تھی۔ ان کو مسلح کرنے اور فوجی تربیت دینے کے لیے دیسی رجواڑوں نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پنجاب کی خانہ جنگی میں جو ہتھیار استعمال ہوئے ہیں وہ دیسی ریاستوں نے مہیا کیے جن میں پٹیالا اور فرید کوٹ کی سکھ ریاستیں اور بہاولپور کی مسلم ریاست پیش پیش تھی ان میں زیادہ تر جنرل ہیڈ کوارٹر کے وہ ہتھیار تھے جو انگریزوں نے دیسی رجواڑوں کے سپرد کر دیے تھے۔

رجعت پرست عناصر کی تنظیم اکالیوں کے "شہیدی دل" ہندوؤں کے "راشٹریہ سیوا سنگھ" اور مسلمانوں کے "مسلم نیشنل گارڈ" کی شکل میں ہوئی۔ ان رجعت پرستوں نے ہندستان میں ہندو حکومت اور پاکستان میں مسلم حکومت کے نعرے بلند کیے۔ اور جمہوریت اور آزادی کی ناؤ انسانی خون کے بھنور میں چکرانے لگی۔

آج مشرقی پنجاب میں ایک بھی مسلمان باقی نہیں ہے مغربی پنجاب میں کوئی سکھ یا ہندو دکھائی نہیں دیتا سینکڑوں برس پرانی بستیاں لٹ گئیں، ہزاروں ہندو مسلمان اور سکھ عورتوں کے ساتھ سڑکوں پر زنا کیا گیا۔ لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ایک کروڑ کے قریب انسان بے گھر ہو گئے۔ کھیتیاں اجڑ گئیں، کارخانے بند ہو گئے۔ کتابوں کی دکانیں اور مکتبے جل گئے۔ مکتبوں اور مدرسوں میں اُلّو بولنے لگے۔ ہوائیں لاشوں کے تعفن سے گندی ہو گئیں دریاؤں کے پانی سے بو آنے لگی۔ انگریزوں نے پرامن طریقے سے جو اقتدار منتقل کیا تھا وہ ہمارے اپنے ہی بھائیوں کے خون میں ڈوب گیا۔ انگریزوں کا امن ہندستانیوں کی خانہ جنگی میں تبدیل ہو گیا، ظاہر ہے کہ اگر پھوڑے کو چیرا نہ جائے تو وہ جسم میں زہر پھیلا دے گا۔

لیکن کیا انگریز سامراجیوں، فرنگی حاکموں، دیسی رجواڑوں اور ہندو مسلم اور سکھ رجعت پرستوں کو الزام دے کر ہم اپنے ترقی پسند ضمیر اور مہذب دل کو مطمئن کر سکتے ہیں؟ کیا ہم نے اپنے فرائض انجام دیے ہیں؟ ہمیں اپنے عمل کا بھی جائزہ لینا پڑے گا۔ ہمارے گھر میں رجعت پرست عناصر کا وجود اس کا ثبوت ہے کہ ترقی پسند قوتوں میں ابھی کچھ کمزوریاں باقی ہیں اور اس کمزوری کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے، ہماری قومی آزادی کی تحریکوں اور ہمارے رہنماؤں کی سیاست کے اوپر ہے۔ یہ خانہ جنگی فرنگی سیاست کی کامیابی کی دلیل ہے اور اس کے خلاف انقلابی جد و جہد کرنے کے لیے ہمیں اپنی صفوں کو پھر سے آراستہ کرنا پڑے گا۔ نئے

مورچے زیادہ مضبوط بنانے پڑیں گے۔ اور نیا حملہ زیادہ ہمت سے کرنا پڑے گا۔

ایک اور بھی بڑا سوال ہے۔ نفرت کا جو زہر عام انسانوں میں سرایت کر گیا ہے اسے کیسے نکالا جائے۔ ہندستان کے ہندوؤں اور سکھوں نے اور پاکستان کے مسلمانوں نے اس خانہ جنگی میں جس بربریت اور درندگی کا اظہار کیا اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس ملک میں گوتم بدھ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ ایشیا کے کانوں نے عرب کے رسول کی آواز کبھی سُنی ہی نہیں تھی۔ جیسے اجنتا کے نقوش کبھی نہیں ابھرے تھے۔ ایلورا کے بُت کبھی نہیں تراشے گئے تھے۔ تاج محل کبھی نہیں بنا تھا۔ ٹیگور اور اقبال نے اپنے گیت کبھی نہیں گائے تھے۔

اس وقت ملک میں چاروں طرف نفرت کا دور دورہ ہے۔ وہ لوگ بھی جو فساد نہیں چاہتے اس نفرت کا شکار ہو رہے ہیں۔ بہت سے نیشنلسٹ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ ہندستان سے سارے مسلمانوں کو نکال دو۔ ایک پاکستانی ادیب نے مجھے لکھا ہے کہ سکھ کا نام سُن کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے سارے ہندستان اور پاکستان کے ایک ایک رونگٹے سے نفرت خون کی طرح رِس رہی ہے۔ انسان کی صدیوں پرانی وحشت بیدار ہو گئی ہے اور تہذیب و تمدن کا خول سانپ کی کینچلی کی طرح اُتر گیا ہے۔ وہ درندہ جو آج سے کئی ہزار برس پہلے پہاڑوں کے غاروں اور درختوں کے کھوکھلے تنوں میں رہتا تھا۔ آج مہذب بستیوں میں اپنے خونیں دانت نکالے ہوئے پھر رہا ہے۔

مشرقی اور مغربی پنجاب کی معاشی اور سیاسی بربادی کا غم بہت ہے۔ لیکن اس سے بڑا دکھ تو یہ ہے کہ ہم کتنے ذلیل ہو گئے ہیں، دنیا کی نظروں میں ہماری کیا آبرو رہ جائے گی۔ مانا کہ قتل و غارت گری کی ذمہ داری گنڈوں اور رجعت پرستوں پہ ہے۔ لیکن

بحیثیت انسان کے ہم ہر اُس بچے کی موت کے ذمہ دار ہیں جو چاہے پاکستان میں مارا گیا ہو چاہے ہندستان میں۔ اور اس سے زیادہ ہم ان قاتلوں کے اخلاق و کردار کے ذمہ دار ہیں جن کی تعداد اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں ضرور ہے، وہ ہماری سماجی اور مجلسی زندگی میں برابر کے شریک ہوں گے۔ میں سوچتا ہوں کہ ان کی نفسیاتی کیفیت کیا ہوگی۔ وہ سوتے میں کیسے خواب دیکھیں گے جب وہ اپنی بیویوں کو پیار کریں گے تو ان کے کانوں میں کسی کی چیخوں کی آواز آئے گی یا نہیں اور جب وہ اپنے بچوں کو گود میں لے کر کھلائیں گے تو انھیں کیسی کہانیاں سنائیں گے۔ بلونت گارگی نے ایک ایسے قاتل کو دیکھا ہے۔ وہ سوتے میں تڑپتا ہے، پہلے کہتا ہے "مارو۔ مارو" پھر خود ہی چلاتا ہو "مجھے مت مارو۔ مجھے بچاؤ" اس کی انسانی روح اس کی درندگی کے خلاف احتجاج کر رہی ہے، اس کا ضمیر فریاد کر رہا ہے، اس نے دوسرے انسانوں کو قتل کے ساتھ اس انسان کو بھی قتل کر دیا ہے جو اس کے سینے کے اندر تھا۔ ایسا آدمی ہماری سماجی اور مجلسی زندگی پر کیا اثر ڈالے گا۔

میں سوچتا ہوں کہ ملک میں امن قائم ہو جائے گا۔ اُجڑے ہوئے کھیت پھر لہلہانے لگیں گے۔ ہم اپنے بازؤں کی قوت سے دیو ہیکل مشینیں کھڑی کر دیں گے لیکن ان قاتلوں کا ضمیر کیسے پاک ہو سکے گا جنھوں نے اپنی بہنوں کے ساتھ زنا کیا ہے۔ جنھوں نے ننگی عورتوں کے جلوس نکال کر اللہ اکبر۔ ست سری اکال اور ہر ہر مہادیو کے نعرے بلند کیے ہیں۔ جنھوں نے ماؤں کی دودھ بھری چھاتیاں کاٹی ہیں اور بچوں کی لاشوں کو نیزوں پر اٹھا کر قہقہے لگائے ہیں۔ ہم اس اناج کو کیسے کھا سکیں گے جو ان کھیتوں میں پیدا ہوگا جن کی خاک میں ہزاروں بے گناہوں کی لاشیں کھاد بن گئی ہیں۔

کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ بچے بڑے ہو کر کیسے ہوں گے جنھیں لاشوں کے بیچ رینگنا پڑا ہے ان لڑکیوں کی محبت کیسی ہوگی جن کے دلوں میں مرد کی وحشت سمائی ہے، جن کی عصمت آزادی کے نام پر لوٹی گئی ہے اور جن کے پیٹ میں نفرت کے بیج زندگی کی کلی بن کر کھل رہے ہیں۔ وہ لوگ کیسے ہوں گے جو موت کے منھ سے باہر نکل آئے ہیں اور اب ان کے ایک ایک رونگٹے میں خون بھرا ہوا ہے۔

ہمیں صرف آزادی کی مسلی ہوئی کونپلوں کی آب یاری ہی نہیں کرنی ہے۔ فتح کی ٹوٹی ہوئی خوبصورت محرابوں کو ہی نہیں جوڑنا ہے بلکہ غلامی کے اس کوڑھ کا علاج بھی کرنا ہے جو ہمارے جسموں سے دلوں سے اور روحوں سے نفرت، انتقام اور فساد بن کر ٹپک رہا ہے۔ صدیوں پرانا غاروں میں رہنے والا درندہ ابھی پوری طرح انسان نہیں بنا ہے ہمیں خود اپنی انسانیت کی تربیت کرنی ہے سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ روحانی پاکیزگی کے لیے بھی جدوجہد ضروری ہے۔

کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں دیوتاؤں اور راکششوں میں لڑائی ہوئی تو انھوں نے سمندر کو متھ ڈالا۔ اس میں سے پہلے امرت نکلے اور پھر زہر، شیو نے دنیا کو بچانے کے لیے وہ زہر پی لیا۔ آج ہندستان سچ مچ ایک متھے ہوئے سمندر کی طرح ہے جس میں آزادی کا امرت بھی نکلا ہے اور نفرت اور خانہ جنگی کا زہر بھی۔ اس کو پینے کے لیے ایک شیو کافی نہیں ہم کروڑوں کی ضرورت ہے۔ اکیلے گاندھی جی اس زہر کو اپنے حلق کے نیچے نہیں اتار سکتے بلکہ ہم سب کو مل کر، ایک ایک بچے، ایک ایک عورت، ایک ایک مرد کو یہ زہر پینا پڑے گا نہیں تو سب بھسم ہو جائے گا۔

ہمیں ادیبوں کی حیثیت سے اپنے فرائض پورے کرنے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

اُردو ادیب جاگ رہے ہیں۔ اور وہ اس وحشت درندگی اور روح کے گھنونے پن کو محسوس کر رہے ہیں جس نے ہندوستانی زندگی کو روگ لگا دیا ہے بمبئی کے ادیبوں اور فن کاروں نے امن کا جلوس نکالا۔ پاکستان کے ادیب ابنی کانفرنس کر رہے ہیں۔ لیکن اکثریت کی زبانیں ابھی گنگ ہیں۔ ان کے قلم خاموش ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے اوپندر ناتھ اشک عصمت چغتائی، احمد عباس، کیفی اعظمی، یوسف ظفر، فکر تونسوی اور کرشن چندر کے علاوہ کسی ادیب نے فساد پر قلم نہیں اٹھایا ہے۔ اب تو جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت اچھا ہے لیکن کافی نہیں ہے۔ یہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کے برابر ہے، غنڈوں کے چھرے قلم سے زیادہ تیز چل رہے ہیں۔ ان کی بندوقوں کی آواز میں شاعروں کی آواز سے زیادہ بلند ہیں انسانی خون کا سیلاب ان ادب پاروں کو بہا لے جائے گا۔ ہمیں ابھی اتنی کتابیں لکھنی ہیں کہ ہم ان کے ڈھیر سے بند باندھ سکیں پشتے بنا سکیں۔ اس کو ہنگامی ادب کہہ کر صرف وہی لوگ ٹال سکتے ہیں جن کی روحیں سڑ گئی ہیں اور شعر و فن کے چشمے خشک ہو گئے ہیں۔

آج چالیس کروڑ ہندوستانی اور پاکستانی ایک ایک ادیب اور ایک ایک شاعر کو نام لے لے کے آواز دے رہے ہیں۔ تم نے ہمارے گونگے جذبات کو زبان عطا کی تھی۔ آؤ ہمارے دلوں کے نئے زخم دیکھو، اپنے چاروں طرف مڑ کر دیکھو، تمھیں بے شمار سہمی ہوئی آنکھیں نظر آئیں گی سنو ہمارے اینٹھے ہوئے ہونٹوں پر کون سے لفظ تڑپ رہے ہیں۔ ہمارے سینوں میں کیسے نعرے جکڑے ہوئے ہیں جو نکل آنے کے لیے بیتاب ہیں۔ تم ان گیتوں کو گا سکتے ہو جو ہم گانا چاہتے تھے اور نہیں گا سکے۔ تم ان کہانیوں کو سنا سکتے ہو جو لہولہان ہو گئی ہیں۔ ان ادھورے خوابوں کو پورا کر سکتے ہو جن کے تار و پود بکھر گئے ہیں۔

آج ہندستان کی آواز آ رہی ہے۔ پاکستان کی آواز آ رہی ہے چالیس کروڑ

انسانوں کی آواز آرہی ہے اور انھیں کے ساتھ ادیبوں اور شاعروں کی آوازیں بھی آرہی ہیں، جن میں کرشن چندر کی آواز سب سے زیادہ بلند ہے۔ لیکن یہ آوازیں ابھی دھیمی ہیں۔ ان میں آہستہ آہستہ بجلیوں کی کڑک اور بادلوں کی گرج پیدا ہو رہی ہے۔

لیکن دنیا ہندستان کے قہقہے کی منتظر ہے۔

سردار جعفری

بمبئی

۱۶ نومبر ۱۹۴۷ء

اندھے

چوک بنی کے اندر کوچہ پیر جہازی میں صرف دو گھر ہندوؤں کے تھے۔ ایک سہ منزلہ مکان گلی میں سب سے اونچا اور خوش حال مکان لالہ بانشی رام کھتری کا تھا۔ پنجابی کھتری نہ تھے۔ یو۔پی کے کھتری تھے، اور ہر وقت ہندستانی میں بات کرتے تھے اس لیے سب پنجابیوں کو ان سے نفرت تھی۔ سالوں کی زبان کیا کترنی کی طرح چلتی تھی۔ ان کے گھر کی عورتیں ناچ گانے کی بڑی شوقین تھیں۔ ریڈیو ہر وقت چلتا رہتا۔ پشپا گھر کی سب سے چھوٹی لڑکی سولہ سترہ برس کی ہو گی۔ اور اکثر سہ منزلہ عمارت کی چھت پر کھڑی ہو کر مجھے الکانے کے لیے ناچ کیا کرتی۔ میں اپنے مکان کی چھت پر سے اور وہ اپنے مکان کی چھت پر سے ایک دوسرے سے عشق کیا کرتے۔ مگر میں مسلمان تھا اور وہ ہندو۔ میں چمار تھا اور وہ کھتری اور وہ بھی یو۔پی کے۔ پھر پشپا تو کیا گھر کی دوسری عورتیں بھی گلی میں اکیلی دکیلی نہ دکھائی دیتیں۔ وہ لوگ بانشی باغ سیر کو بھی جاتے تو موٹر میں بیٹھ کر یہاں ہمارے گھر کی عورتوں کو بازار سے سودا سلف بھی لانا پڑتا۔ پردہ سنبھالنا تک مشکل تھا۔

ایسی صورت میں ہر شریف مسلمان محلے والے کو لالہ بانسی رام کھتری کے گھرانے سے چڑھ تھی۔ اور یوں بھی تو یہ لوگ بہت کمینے تھے مسلمانوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ کون کافر ایسا ہے جو مسلمان سے دھوکا نہ کرتا ہو۔ یہ تو ان لوگوں کے خمیر میں ہے۔ ہندو مسلمان کا سا دل نہیں رکھتا جس طرح مسلمان صاف اور کھری بات سب کے سامنے کہہ دیتا ہے۔ ہندو تو بس زبان کا میٹھا ہے۔ اندر سے بس بھرا ہے۔ جس نے ہندو بچے پر اعتبار کیا وہ مرا۔

دوسرا گھر رام نرائن برہمن کا ہے۔ یہ گھر بالکل ہمارے گھر کے سامنے ہے۔ رام نرائن کی ماں ایک ہی لڑاکا عورت ہے، محلے بھر کی عورتیں ایک طرف اور وہ ایک طرف زبانی گالی گلوچ میں کوئی اس سے بازی نہیں لے جا سکتا۔ ایسے کڑوے کرخت لہجے میں بات کرتی ہے کہ آدمی کا جی جل کے کباب ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں چار غیں طعنے تشنیع گالی گلوچ میں بیحد ہوشیار مگر رام نرائن کی ماں کے آگے وہ بھی ہاتھ جوڑتی ہیں۔ سارا محلہ اس سے ناراض تھا۔ رام نرائن خود بے حد شریف برہمن تھا گائے کی طرح سُست رفتار اور بھولا بھولا سا ہر وقت اپنے دھرم دان میں مگن رہتا ہر ایک سے ہنس کر بات کرتا۔ میں نے کبھی اس کے منہ سے گالی نہیں سُنی، کوئی کڑوا بول نہیں سُنا۔ محلے بھر میں کسی سے لڑائی نہیں لیتا۔ ایسا آدمی بھی کس کام کا یعنی کسی بات پر لڑے گا ہی نہیں۔ اب جب دوسرا آدمی اس قدر میٹھا ہو تو ہم کس طرح اس سے جھگڑیں۔ اس سے جھگڑنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ مگر ہمیشہ طرح دے جاتا مجھے تو ایسے آدمیوں سے سخت کد ہے۔ اب بھی ایک ہی محلے میں رہتے ہیں۔ کبھی تو برتن سامنے رکھے ہوئے کھڑکھڑا اُٹھتے ہیں۔ اور ایک تم ہو کہ کبھی بولتے ہی نہیں۔ رام نرائن جب دیکھو بھیگی بلی بنا ہوا ہے۔ سر جھکائے گلی سے باہر آ رہا ہے۔ گھر کے

اندر جا رہا ہے کسی نے بلایا جھٹ بتیسی نکال کے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بڑا ہی بزدل ریہین تھا مال خور۔ رام نرائن کے تین بچے تھے تینوں اسکول میں پڑھتے تھے۔ چوتھا لڑکا کوئی ایک سال کا ہوگا۔ ایسے اکثر میں نے رام نرائن کی بیوی کے نتھنوں سے لٹکتے ہوئے اس کے گھر کے دروازے پر دیکھا تھا۔ یہ ہندو عورتیں کس قدر بے حیا ہوتی ہیں۔ نہ پردہ، نہ شرم، نہ لاج، سب کے سامنے چھاتی کھول کر دودھ پلانے لگتی ہیں اور یہ بچے بھی کیا جُسر جُسر دودھ پیتے ہیں۔ اور ..... جب فساد شروع ہوا تو شروع شروع میں یہاں صلح کمیٹی بنی۔ اس میں رام نرائن اور لالہ بانسی رام بھی شریک تھے۔ ہم لوگ اس جھنجھٹ میں نہیں تھے مسلمانوں کی طرف سے ہم نے مسجد کے ملّا جی اور لکڑیوں کی ٹال کے مالک فتح محمد کو بھیج دیا تھا۔ دراصل ہمارا جی اس صلح کمیٹی میں نہ تھا۔ کوئی چیر پھاڑ ہو، مار پیٹ ہو، دھول دھپا ہو، تو اس میں مزا بھی ہے۔ یہ کیا اندر ہی اندر تو بغض بھرا ہے اور اوپر سے صلح کمیٹیاں بنا رہے ہیں، ہم نے سوچا چلو انھیں صلح کمیٹیاں بنانے دو یہ چلنے چلانے کی چیز نہیں ہے۔ لالہ بانسی رام کھتری بہت پریشان معلوم ہوتے تھے اور اس سلسلے میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے تھے چودھری فتح محمد نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اگر وہ ٹھیک ڈھنگ سے رہے تو کوئی مسلمان ان پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ ہاں اگر انھوں نے زیادہ جیں جیٹ کی اور فوں فاں سے کام لیا تو ان کی جان مال کی خیر نہیں۔ لالہ بانسی رام بھری مجلس میں ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو گئے۔ بولے ہم تو پچاس برس سے آپ کے ہمسائے ہیں۔ ہمارے دادا لالہ سکھن رام آنریری مجسٹریٹ بھی یہیں رہتے تھے۔ یہ سن کر بڈھا پیراں بخش بولا۔ ان کی بات رہنے دو۔ ایک ہی حرامی تھا تمھارا دادا سکھن رام آنریری مجسٹریٹ۔ میرے بیٹے کو چھ ماہ قید اسی نے سنائی تھی۔ اور کیا ذرا سی بات تھی اس نے بنیے کی دکان سے دس روپے اٹھا لیے تھے۔ ابھی بڈھا پیراں بخش کچھ اور کہنا چاہ

رہا تھا۔ کہ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرکے اسے چپ کرا دیا۔ لالہ بانشی رام بہت خفیف ہوئے۔ مگر انھوں نے چپ رہنے ہی میں مصلحت سمجھی اور اگر لالہ بولتا بھی تو بری طرح پٹتا کیونکہ مسلمان جوان ایسے تھے جو ذرا بھی ایسا ویسا کلمہ زبان سے نکالتا اس کی کھال وہیں اُدھیڑ کر رکھ دیتے خیر یہ صلح کیسی تھی۔ کتنے دن رہتی ختم ہو گئی۔

پہلے تو کوئی نہیں بولا۔ پر جب بہار میں مسلمانوں پر آفت آ پڑی تو ہمارا خون بھی کھولنے لگا۔ یہ سالے اوپر چڑھے جا رہے ہیں۔ ارے ابھی کل کی بات ہے کہ ہم سارے ہندستان کے بادشاہ تھے اور یہ دال کھانے والے کافر ہماری جوتیوں تلے لوٹتے تھے اور آج ان کی ہمت ہو گئی۔ چنانچہ میں نے اور رشید بھائی نے اور پیچو موچی نے اور گلا پہلوان نے اور گلی کے دوسرے آٹھ دس جوان جوان چھوکروں نے فیصلہ کر لیا کہ یہاں ہندوؤں کو اس کا مزا چکھا کر رہیں گے۔ مسجد کے مُلّا نے خلاف تو تقریر اس کے لیے بہت برا بھلا کہا۔ پر ہم یوں تو چپ رہے مگر اندر ہی اندر اپنی اسکیم کی یونہی تیاری کرتے رہے۔ دو چار دنوں میں ہم نے اپنے گھروں کی عورتوں کو بھاٹی گیٹ بھیج دیا کیونکہ چوک متی کا کوچہ پیر جہازی لاکھ مسلمانوں کا محلہ سہی پھر بھی شاہ عالمی کا دروازہ یہاں سے بہت قریب ہے اور شاہ عالمی کے دروازے میں ہندوؤں کا بڑا زور تھا۔ کسی وقت بھی یہاں حملہ ہو سکتا تھا۔ ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی عورتوں اور بچوں کو بھاٹی گیٹ بھیج کر بے فکر ہو جائیں۔ چنانچہ ہم لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد ہی فساد شروع ہو گیا۔ شروع ہندوؤں نے کیا۔ کرشنا گلی رام گلی میں۔ کرشن نگر میں سنت نگر میں۔ شاہ عالمی میں؟ جہاں جہاں لاہور میں ہندوؤں کا زور تھا۔ وہاں اِکّے دُکّے مسلمان مارے جانے لگے۔ اب ہم لوگ کہاں تک چپ رہتے مسلمان غریب ہو۔ بے وقت ہو۔ نکما ہو۔ مگر وہ بزدل نہیں ہے۔ ایک دفعہ اللہ کا نام لے کر

جرلاہور کا مسلمان اٹھا تو دو دن میں ہندوؤں اور سکھوں کو اپنی نانی یاد آگئی۔ اکبری دروازے سے بھاٹی گیٹ تک اور شاہ عالمی سے تباہی لٹے تک ہر جگہ نعرۂ تکبیر سنائی دینے لگا سب بنئے، لالے، کھتری، برہمن، اپنی ماں کی گود میں دبک کر بیٹھ گئے۔

کوچہ پیر جہازی کے نوجوان مسلمان بھلا کہاں چپ بیٹھنے والے تھے۔ پہلے تو ہم نے لالہ بالمتی رام کھتری کے مکان کے اندر گھس جانے کی کوشش کی مگر اس بدمعاش ہندو نے بڑا پکا انتظام کر رکھا تھا۔ لوہے کا دروازہ اس نے حال ہی میں لگوایا اور مکان کے عقب میں ہندوؤں کا محلہ تھا بسر بن کا محلہ جہاں کئی مسلمانوں کی جانیں جا چکی تھیں۔ اس لیے ہم لوگ عقب سے حملہ نہ کر سکتے تھے اور سامنے لوہے کا دروازہ تھا۔ دو تین بار ہلّہ بول کے ہم لوگ چپ ہو گئے۔ ہم ترنت آگے، ہم نے اس کے گھر کو آگ لگا دی۔ اب کیا کیا جائے اس کے گھر میں کوئی نادر اور قیمتی اشیاء تھیں اور سنا ہے کہ بہت زیور اور اناج بھی تھا۔ پر یہیں کچھ نہ ملا مکان ایسے جلا جیسے سوکھی لکڑی چوطرفے میں چیخ چیخ کر جلتی ہے۔ شعلے دور دور تک دکھائی دے رہے تھے۔ لالہ بالمتی رام نے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو بچانے کی طرح کوشش کی مگر بچارا کامیاب نہ ہوا۔ بہت بہت منتیں خوشامدیں اس نے کیں۔ مگر ہم لوگ ہنسا کیے لیں مجھے ایک پیشاپ کے مرنے کا افسوس ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اسے مرنے سے بچا لیتا۔ وہ مکان کے اندر اندر آگ میں جل کے مرگئی اور میں کچھ نہ کر سکا۔ کرتا بھی کیا اس وقت لوگ کتنے مسلمان ہو کے ہندو کی طرفداری کرتا ہے۔ اس خیال سے چپ ہو گیا۔ مرتے وقت نہ جانے اس کی کیا حالت تھی تیسری منزل سے اوپر کی چھت کی طرف تو میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا پریشانی کے عالم میں بھاگ رہی تھی۔ لالہ بالمتی رام

کی بیوی کے سارے کپڑے جل رہے تھے اور اس نے تیسری چھت سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی خیر جلتی آگ سے کون بچ سکتا تھا۔

جب لالہ بانشی رام کا مکان جل رہا تھا تو کسی نے دیکھا کہ ہندوؤں کا دوسرا گھر بھی طرح محفوظ و مامون ہے سب لوگ رام نرائن برہمن کے گھر کی طرف دیکھنے لگے جو اس وقت سب کے سامنے مجسم سوال تھا۔ پھر ہم سب لوگ اس گھر کی طرف بڑھے۔ یہاں معمولی سا کواڑ تھا چٹخنی اندر سے لگی ہوئی تھی۔ دروازہ کھٹ کھٹانے پر بھی جب کسی نے جواب نہ دیا تو رشید بھائی اور گلے پہلوان نے شانوں سے ٹکریں لگا کر دروازے کو توڑ دیا۔ اندر سامنے ہی رام نرائن برہمن ہاتھ جوڑے کھڑا تھا بے چارہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"رشید نے پوچھا۔" دروازہ کیوں نہیں کھولا سور"

جی۔ جی۔ میں سو رہا تھا۔

مجھے بڑی ہنسی آگئی مگر میں نے ضبط کیا۔

گلے پہلوان نے کہا۔ "اب یہاں کھڑے کیا کر رہا ہے چل باہر چل"

"باہر جا کے کیا کروں گا"

"باہر تو نکل۔ یہاں کھڑا کھڑا کیا جواب دیتا ہے"

گلے پہلوان نے اس کی گدی پر ہاتھ رکھا اور اسے ایک دھکا جو دیا تو سیدھا چوکھٹ سے باہر وہ چوکھٹ سے باہر گر رہا تھا کہ بھیجے نے اس کی پیٹھ میں چاقو مارا۔ اور وہ وہیں دھڑام سے گر کر تڑپنے لگا۔ اس کی ماں روتی پیٹتی باہر آئی بھیجے نے اسے بھی چاقو مارا اور وہ بھی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ اپنے بیٹے کی تڑپتی ہوئی لاش پر گر گئی۔ اس کے بعد رام نرائن کی بیوی کی باری آئی۔ اس نے زیادہ مزاحمت نہ کی۔ چار بچوں کی ماں تھی۔ اور بدصورت،

کوئی اس کو مسلمان بنانے کے لیے بھی تیار نہ تھا لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس کا سب سے چھوٹا لڑکا جو ایک سال کا تھا اب تک بنگوڑے میں پڑا سو رہا تھا۔ بنہایت اطمینان سے جیسے کچھ ہوا نہ تھا ہم سب لوگ بنگوڑے کی طرف گئے، یہ سو رہا تھا۔ رشید نے چھرا نکالا۔ یکایک میرے ہاتھ نے اسے روک دیا۔

"کیوں" رشید نے کہا "سانپ کا بچہ ہے!"

"جانے دو" میں نے کہا۔ "بڑا ہوگا، مار ڈالیں گے!"

"نہیں" پیچھے نے ذرا نرمی سے کہا۔

"نہیں" میں نے سختی سے کہا۔ چھوڑو اسے۔ دراصل مجھے اپنا ننھا یعقوب یاد آگیا تھا۔ اس کی عمر بھی اس وقت ایک سال کی تھی۔ بچے کو چھوڑ کر ہم لوگ گھر کا ساز و سامان دیکھنے لگے۔ ڈیڑھ دو ہزار کے زیورات اور آٹھ سو روپیہ نقد۔ یہ ہم لوگوں نے آپس میں بانٹ لیے۔ نیٹروں کے صندوق میں بچوں کے کپڑے تھے جو ابھی اسکول سے واپس نہ آئے تھے۔ رام نرائن کی ماں کی شادی کے جوڑے جو اس نے اب تک سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ پھر خود رام نرائن کی بیوی کے جہیز کے کپڑے تھے۔ یہ بھی ہم لوگوں نے بانٹ لیے۔ میرے حصے میں چھ ریشمی ساڑھیاں آئیں۔ اور دو سرے سوتی کپڑے۔ گہنوں میں میں نے اپنی بیوی کے کانوں کے لیے آویزے پسند کیے، اور ماتھے کا جھومر اور ایک چاندی کا گلاس۔ مال غنیمت سمیٹ کر ہم لوگوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا، باہر فرش خون سے لال تھا اور گوشی کے گلے سڑے ٹکڑوں اور ناکارہ چیتھڑے کے ٹکڑوں اور کیلے کے چھلکوں کے بیچ میں تھالی کے پاس رام نرائن اور اس کی ماں اور اس کی بیوی کی لاشیں پڑی تھیں۔ سامنے لالہ بانشی رام کھتری کا مکان جل رہا تھا اور لوہے کے دروازے کے سامنے اس کی بیوی کی لاش پڑی تھی جس نے تیسری منزل

سے چھلانگ لگائی تھی۔ سب گھر خاموش تھے۔ سب دکانیں بند تھیں۔ گلیاں سنسان تھیں اور بازار ویران۔ کہیں کہیں لیگ کے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر مختلف گلیوں میں مڑ کر اپنی اپنی جگہوں کی راہ لی۔ گلامتی گیٹ چلا گیا۔ بھیا اکبری منڈی چلا گیا۔ میں اور رشید بھاٹی گیٹ کی طرف روانہ ہوئے جہاں داتا کے دربار کے عقب میں ہم نے اپنے بیوی بچوں کو رکھ چھوڑا تھا۔ چچا نور الٰہی کے گھر میں۔

داتا کے دربار کے قریب مسلمانوں کا ایک بہت بڑا ہجوم تھا اور اللہ اکبر کے نعرے بلند کر رہا تھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ درشن نگر کے ہندوؤں کی مہا سبھائی ٹولی نے داتا کے دربار کی جانب عقب سے حملہ کیا اور آتے ہی آگ لگا دی۔ ہم لوگ بھاگے بھاگے اپنے گھر کی طرف دوڑے۔ راستے میں چچا نور الٰہی سر پیٹتے ہوئے ملے۔ بولے۔ "ولے بیٹا۔ غضب ہو گیا۔"

"کیا ہوا چچا"۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہندوؤں نے ہمارے گھر کو آگ لگا دی۔ تیری چچی جل کے مر گئیں۔ ہائے ہائے۔

"اور میری بیوی" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کافروں نے اسے جان سے مار ڈالا!"

گھر راکھ کا ڈھیر تھا۔ ابھی آگ پوری طرح سے بجھی نہ تھی۔ دروازے پر میری بیوی کی لاش تھی۔ اس کا سر کسی نے کچل دیا تھا۔ میرا بڑا بیٹا داؤد۔ سات برس کا داؤد، چاند سا ہمارا بیٹا داؤد اس کے قریب مردہ پڑا تھا۔ اس کی گردن میں ایک گہرا شگاف تھا۔

میں اپنے بچوں کے لیے کپڑے لایا تھا۔ اپنی بیوی کے لیے ماتھے کا جھومر اور بنارسی ساڑھیاں۔ میرے اللہ یہ کیا غضب ہے۔

میں نے چچا سے پوچھا۔ اور میرا یعقوب تو سلامت ہے۔ کہہ دو چچا وہ تو سلامت ہے۔

چچا نورا بولے۔ اسے کافروں نے پہلے تو چھوڑ دیا تھا۔ پھر کسی نے کہا یہ تو سانپ کا بچہ ہے اس لیے انھوں نے اس پر بھی پٹرول چھڑک دیا۔ وہ ہے تمھارا یعقوب۔

کونے میں چند جلی ہوئی ہڈیاں اور خاکستر سر۔ چھوٹا سا۔ ننھا سا خاکستر سر!

تم کیا سب مر گئے تھے چچا؟

محلے میں کوئی مرد نہیں تھا۔ نورا نے کہا۔ ہم لوگ سب لوٹ مار کے لیے گئے ہوئے تھے۔ کسے معلوم تھا بزدل ہماری غیر حاضری میں حملہ کریں گے۔ اور وہ بھی یوں نہتی عورتوں پر۔

میں نے سارے شیاں۔ زیور اور چاندی کا گلاس اپنی بیوی کی لاش کے سامنے رکھا۔ اور اس سے کہا۔ مجھے تیری قسم ہے عائشہ اگر میں نے تیرے خون کا بدلہ نہ لیا ہو تو اپنے باپ کی نہیں کسی سور کی اولاد ہوں۔ اتنا کہہ کر میں نے چھرے کو ہاتھ میں پکڑا اور گلی کے باہر چلا گیا۔ رشید میرے ساتھ ہو لیا۔

اب کہاں جا رہے ہو۔ پولیس آ رہی ہے۔

پولیس کی ماں کی اور پولیس کی بہن کی۔ میں اس وقت سیدھا شاہ عالمی جا رہا ہوں۔ کسی میں ہمت ہو تو مجھے روک لے۔ اللہ اکبر۔

لال باغ

کملاکر کے جبڑے بڑے مضبوط تھے۔ اتنے مضبوط کہ رخسار کی ہڈی اور جبڑوں کے درمیان کے گوشت میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ اس کا رنگ گورا تھا۔ قد لمبا، جسم گٹھا ہوا۔ آنکھوں میں بلی کی سی چمک اور مکاری پائی جاتی تھی۔ کملاکر کی عمر پچاس کے قریب ہوگی۔ لیکن دیکھنے میں وہ تیس سے کچھ کم ہی کا معلوم ہوتا تھا۔ کملاکر لال باغ کا مشہور دادا تھا۔ بچپن میں اس نے جیب کترنے کا فن سیکھا تھا۔ دو چار بار جیل جا کر وہ بمبئی کی سب سے بڑی صنعت کا ایک معزز رکن بن گیا تھا۔ یوں تو بمبئی ایک کاروباری شہر ہے صنعتی مرکز ہے، یہاں ملیں فیکٹریاں۔ تجارتی گودام سب کچھ موجود ہیں۔ لیکن لوہا۔ کاٹن۔ تیل۔ کاغذ اور اناج کے کالے بیوپار سے بڑھ کر بھی جو صنعت یہاں کمال کو پہنچی ہوئی ہے وہ جرائم پیشہ لوگوں کا کاروبار ہے۔ اس میں کروڑوں روپیوں کا لین دین ہوتا ہے اور ملبار ہل سے لے کر مدنپورہ کی جھونپڑیوں تک اس کے بھگتان کرنے والے پھیلے ہوئے ہیں۔ کملاکر اسی معزز صنعت کا ایک فرد تھا۔ اور لال باغ میں داداگیری کرتا تھا۔ داداگیری آسان کام

نہیں اور کرنے سے نہیں آتی۔ ہندستان اور پاکستان کا گورنر جنرل بننا آسان ہے لیکن لال باغ کا دادا بننا آسان نہیں۔ کملا کرنے یہ تاج پچاس برس کی کاوشوں کے بعد حاصل کیا تھا۔ بچپن میں وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کا۔دار سے بمبئی آیا تھا۔ یہاں اس کے ماں باپ وکٹوریہ مل میں نوکر تھے۔ اور وہ دن بھر گلیوں میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ ٹراموں پر بغیر ٹکٹ لیے سوار ہوتا۔ میوہ فروشوں سے الجھتا، بوٹ پالش کرنے والوں کو دھمکاتا۔ خوش پوش راہ گیروں سے بھیک مانگتا۔ پان والوں کی دکانوں سے بیڑی اُڑاتا۔ اور اس طرح کے کئی ایک نیک کام کرتا۔ کہ جن سے غریبوں کے بچوں کا مستقبل تعمیر ہوتا رہتا ہے۔ پھر ایک مہربان نے ترس کھا کر اُسے جیب کترنے کا فن سکھا دیا اور اپنی دانست میں اسے راہِ راست پر ڈال دیا۔ یہ راستہ اسے تین چار بار جیل لے گیا پہلی بار جب وہ ریفارمیٹری اسکول گیا تو اسے اپنا گاؤں یاد آیا۔ اسے چھوٹے چھوٹے مرغی کے چوزے یاد آئے جن سے وہ اپنے گھر کے آنگن میں کھیلا کرتا تھا۔ اسے وہ ندی کنارے جامن کا پیڑ یاد آیا جہاں وہ جبین اور پری جمال گلہریوں کی اچھل کود سے محظوظ ہوتا تھا۔ وہ بندے کی جھاڑیاں یاد آئیں جو ندی کے کنارے اُگ رہی تھیں۔ اور جہاں اس نے ایک مرتبہ شاما کے گھونسلے میں تین نہایت نرم و نازک چتکبرے انڈوں کو دیکھا تھا۔ اس نے انڈے اپنی ہتھیلی میں اٹھا لیے اور دیر تک انھیں چھوتا رہا پھر اس نے انڈے گھونسلے میں رکھ دیے۔ اور ایک خوبصورت تیتری کے پیچھے بھاگا۔ اس کے بھاگنے سے ایک خرگوش چوکنا ہو گیا۔ اور اس کے سامنے سے لمبے لمبے کان کھڑے کیے ہوئے تیر کی طرح بھاگا۔ اور وہ وہیں کھڑا ہو کر ہنسنے لگا ہنسی فضا میں رنگ بھرتی جا رہی تھی، اس کے قہقہے گونج رہے تھے۔ یکایک خرگوش دور جا کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے مڑ کر

اس کی طرف دیکھنے لگا کہ یہ لڑکا کیوں ہنس رہا ہے۔ پہلی بار کملاکر کو یہ سب کچھ یاد آیا۔ دوسری بار وہ ریفارمیٹری میں نہیں جیل میں لایا گیا۔ اب اسے لمبئی کی گلیاں یاد آئیں۔ لمبئی کے بازار اور مون سون کی بارش جب گرم گرم ابلی ہوئی نمکین مونگ پھلیاں چائے کے ساتھ کھانے میں مزا آتا تھا۔ اور اس کے بعد پانچ نمبر والی بیڑی، اسے فٹ بال کے میچ یاد آئے جو اس کے قریب ہی انگلو انڈین کلب لال باغ میں ہوا کرتے تھے۔ کس قدر دلچسپی تھی اسے فٹ بال میں، زندگی بھر اس نے کبھی فٹ بال نہیں کھیلا تھا۔ وہ فٹ بال کو ہاتھ لگانا چاہتا تھا۔ یہ گول گول چکنا جو دھاگے سے ہوا میں اڑتا ہے۔ اور زمین پر اچھل کر پھر فضا میں پرواز کرتا ہے۔ دھم۔ دھم۔ ادھر دھم دھم اُدھر۔ کملاکر چاہتا تھا کہ ایک ایسی کک لگائے کہ فٹ بال اوپر فضا میں دور میلوں تک اوپر چلا جائے حتیٰ کہ کسی کو نظر بھی نہ آئے۔ اور سب لوگ اسے حیرت سے تکنے لگیں۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہوا وہ تو صرف فٹ بال دیکھنے والے تماشائیوں کی جیبیں کاٹ سکتا تھا۔ اور بس۔ جیب کترنے کے لیے تین جگہیں سب سے عمدہ ہیں۔ ایک تو کھیل کا میدان جہاں تماشائیوں کو کھیل میں اتنی دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ اپنی ساری سدھ بدھ بھول جاتے ہیں۔ دوسری سیاسی جلسہ جہاں مقرر اپنی آتش بیانی سے لوگوں کے دلوں میں یعنی ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کے خلاف۔ اور ہندستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف آگ لگا دیتا ہے۔ کملاکر بھی سیاسی جلسوں میں جاتا تھا۔ اسے میٹھی سنبھلی ہوئی متین تقریریں پسند نہ تھیں۔ ایسے موقعوں پر لوگ جمائیاں لینے لگتے تھے اور اپنی جیبوں سے خبردار ہو جاتے تھے۔ وہاں ایسی تقریریں بہت کم ہوتی تھیں یہی غنیمت تھا۔ نفرت کے جذبات لوگ بڑی خوشی سے قبول کرتے تھے۔

محبت، رواداری، آشتی، صلح، امن کے جذبات لوگوں کو پسند نہ آتے تھے۔ اس لیے اچھے تقریر کرنے والوں کو اس نے کبھی اس غلطی کا مرتکب نہ پایا تھا۔ وہ اکثر سیاسی جلسوں میں جانے سے پیشتر تقریر کرنے والے کا نام پوچھ لیا کرتا تھا۔ جب بھگول نگوانی جیرخے کی افادی حیثیت پر تقریر کرنے کے لیے آتے تو وہ سمجھ جاتا کہ اب اس جلسے میں کسی کی جیب کاٹنا مشکل ہوگا۔ جب چنگلی پھنکار کر گرج دار آواز میں بمبئی کو مہاراشٹر میں شامل کرنے کی دھمکی دیتے اور بمبئی کے غیر مرہٹہ لوگوں کو پھنکارتے تو کملا کر سمجھتا کہ آج دو چار جیبیں ضرور کاٹی جائیں گی۔ اس لیے وہ ہمیشہ سوچ سمجھ کر کے سیاسی جلسوں میں شرکت کرتا تھا۔ ہاں ریلوے پلیٹ فارم پر وہ ضرور جاتا تھا۔ ہر روز دن میں دو تین بار۔ بالخصوص شام کے وقت جب لوگ گھروں کو لوٹتے، اسی جلدی گھبراہٹ اور تابڑ توڑ گھر پہونچنے کی شدید خواہش میں جو اس مجمع میں ہوتی ہے اسے اپنا کام کرنے کا موقعہ مل ہی جاتا تھا۔ لیکن اب وہ اس پیشے سے کچھ بددل سا ہو چلا تھا جس نے اسے دو بار جیل کی ہوا کھلائی تھی۔ اس لیے تیسری بار جب وہ جیل میں آیا تو خوب چوکنا ہو کے، جیسے وہ کسی اسکول میں داخل ہو رہا ہو، اس نے دوسرے جرائم پیشہ قیدیوں سے راہ و رسم پیدا کی اور اب اسے معلوم ہوا کہ اب تک وہ بسم اللہ کے گنبد ہی میں بند تھا۔ بمبئی میں تو ایک سے ایک اونچا کاروبار پڑا ہے جس میں لاکھوں روپے کا روز ہیر پھیر ہوتا ہے۔ یہ جیب کترنا بھی کوئی کاروبار ہے۔ آدمی کام کرے تو لڑکیوں کے بیچنے، لانے لوانے۔ بکوانے کا کام کرے احمد آباد سے چرس، افیم، بھنگ کی درآمد کرے۔ شراب کی بھٹی لگائے۔ گلیان میں بیٹھ کر کوکین سازی کرے، پھر چور بازار کے سودے ہیں۔ قمار خانے ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں کی کمزوریوں سے واقف ہو کر انھیں لوٹنے کے بہانے ہیں۔ میاں یہ جیب کترنا بھی کوئی کام ہے۔ پکڑے جاؤ تو پہلے لوگ پیٹتے ہیں، پھر پولیس پیٹتی ہے، پھر جیل کی چکی پیسنی ہے۔ تیسری بار تو کملا کر

عہد کرلیا کہ اب وہ جیب کترنے کا دھندا نہیں کرے گا۔ تیسری بار جیل جانے کے بعد اس نے افیم اور چرس کی درآمد کا دھندا کیا۔ اور اس میں اسے اور پولیس کو اور دوسرے لوگوں کو اتنا فائدہ ہوا کہ اس نے لال باغ کے دو چار بڑے بڑے سیٹھوں سے مل کر اپنی بھٹی رکھ لی اور بڑے پیمانے پر تجارت کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ کبھی جیل نہیں گیا۔ دو ایک بار پولیس نے اسے تڑی پار ضرور کر دیا تھا۔ لیکن سیٹھوں نے مل ملا کے اسے واپس بلوا لیا۔ اب اس کی عمر پچاس برس کی ہو گئی تھی۔ اس کا اپنا جوا خانہ تھا۔ شراب کی بھٹی تھی۔ افیم کا کاروبار تھا۔ ایک قحبہ خانہ تھا۔ ایک اپنا گھر تھا۔ موٹی سی بیوی تھی۔ چار بچے تھے۔ اس نے اپنے گاؤں میں اپنا گھر اینٹوں کا بنوایا تھا۔ اور وہاں زمین بھی مول لی تھی۔ لال باغ میں ہر کوئی اس کی عزت کرتا تھا۔ وہ جدھر سے گزرتا لوگ اس کی تعظیم کے لیے اُٹھ جاتے اور پھر جھک جاتے اور پھر وہ ان کے سامنے سے گزر جاتا۔

آج بھی جب وہ کھانا کھا کے گھر سے نکلنے لگا تو کئی لوگ اس کی دید کے منتظر باہر کھڑے تھے دست بستہ۔ اس نے کھانا کھا کر اپنی بیوی۔ اپنی چوتھی بیوی کے گال میں چٹکی لی اور تیزاب کی بوتل ہاتھ میں اٹھائے گھر سے نکلا۔ دروازے پر اس کا چھوٹا لڑکا راؤ کھڑا تھا۔ اس نے راؤ سے کہا، دادر کے ناکے کی طرف مت جانا۔ جدھر رنجیت فلم کمپنی کا اسٹوڈیو ہے۔ اس علاقے کے مسلمان لڑکوں سے نہ کھیلا کرو۔ تجھے کتنی بار سمجھایا ہے۔ اب تو نہیں جائے گا۔ راؤ نے کان پکڑ کے کہا "اب کبھی نہیں جاؤں گا دادا۔ راؤ بھی اپنے باپ کو دادا ہی کہتا تھا کیونکہ بچپن ہی سے وہ اپنے باپ کے متعلق ہر کس و ناکس سے یہی لفظ سنتا آیا تھا۔

راؤ کو فہمائش کرنے کے بعد اور تیزاب کی بوتل لے کر دادا کملا کر آگے بڑھا۔ اس کے

چھینتے نائب شنکر نے تیزاب کی بوتل اپنے ہاتھ میں تھام لی اور کملاکر اپنے گرگوں کے جلو میں لال باغ کے بڑے بازار میں آگیا۔ یہاں کل رات سے بڑی گڑبڑ تھی۔ گو بمبئی میں ہندو مسلم فساد ایک سال سے جاری تھا لیکن کل رات سے جھگڑا بہت بڑھ گیا تھا۔ کملاکر فساد ہو جانے سے بہت خوش تھا کیونکہ جب امن ہو جرم کا کاروبار ٹھنڈا پڑ جاتا ہے، پولیس بھی زیادہ ہوشیار ہو جاتی ہے اور فساد میں کسی کو یہ ہوش نہیں ہوتا کہ کل کا راشن کہاں سے آئے گا۔ چرس اور افیم کے کھیپ کون پکڑ سکتا ہے۔ دادا کملاکر کا کاروبار فساد کی وجہ سے بہت اچھا چل رہا تھا۔ سیٹھ پہلے سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے اس نے ہزاروں روپے ہتھیا لیے تھے اور سینکڑوں نوجوان ہندو چھوکروں کا پیٹ بھرتا تھا۔ دوسری صورت میں یہ شریف لڑکے ملوں میں ذلیل مزدوری کرتے اور صبح شام رگڑتے ہوتے۔ اب تو چین تھا۔ اور اچھا کھانا تھا اور جیب میں اعلیٰ سگریٹ اور رات کو شراب اور لڑکیاں۔ اور لوگوں کے دلوں میں وہ ڈر جیسے ہٹلر کے صاحبزادے چلے جا رہے ہوں۔ یہ فساد زندگی بھر رہے تو کیا بُرا ہے۔

شنکر نے کملاکر کے کان میں کہا۔ رات کو چار مسلے گرائے۔

کملاکر نے اُس کی پیٹھ ٹھونکی، شاباش۔ پھر رک کر کہا۔ "کون کون ہیں وہ"

ابھی ان کی لاش اٹھوائی نہیں۔ چلئے دکھاتا ہوں۔

دکٹوریا مل کے ادھر ایک تنگ گلی میں جہاں کارپوریشن کے بھنگی غلاظت جمع کر کے رکھتے ہیں۔ وہاں ایک لڑکے کی لاش پڑی تھی۔ نیم برہنہ، کرتا لپٹا ہوا۔ آنتیں باہر نکلی ہوئی ہاتھ میں تیل کی شیشی۔ شاید گھر سے ماں نے بازار بھیجا تھا کہ سالن میں کڑی لگانے کے لیے تیل لے آئے۔

کیسے پہچانا۔

شنکر نے اشارہ کر کے کہا۔

خستے سے۔

شاباش! کملاکر نے کہا۔ یہ تیل کی شیشی لے لو۔ کسی غریب ہندو کے کام آجائے گی۔

دوسرا موقع کون سا ہے۔ کملاکر نے پوچھا۔

وہ میرے علاقے میں ہے۔ بورکر نے آگے بڑھ کے اور اپنے اُستاد کو خوش کرنے کے لیے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔ بورکر کا ماتھا چھوٹا تھا۔ کان بڑے اور دانت باہر نکلے ہوئے۔ اس کی بانہیں سوکھی تھیں اور ہاتھ اتنے بڑے بڑے کہ انھیں دیکھتے ہی سے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ پریل کے جنوب میں کاردار اسٹوڈیو کے بہت آگے نکل گئے جدھر ایک اکیلی سڑک ویرانے میں سے گزرتی ہوئی ڈاک یارڈ کی طرف جاتی تھی۔ یہاں ایک گڑھے میں ایک بڈھے کی لاش پڑی تھی۔ لاش سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ آدمی زندگی بھر زندہ نہ رہا ہو، ہونٹوں پر، ماتھے پر، آنکھوں کی پتلیوں میں، پیٹ پر، جسم کے ہر حصے میں اس مسلسل موت کے نشان تھے جو ہندستان میں ایک غریب آدمی کے پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتے ہیں اور روز بروز بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ اس بڈھے کی زندگی۔ ایک ایسی پرانی سڑی بوسیدہ کتاب تھی جس کے ہر صفحے پر بھوک، بے کاری، بیماری، قحط کی ہولناکیاں ثبت تھیں۔ یہ کتاب کیچڑ میں پڑی تھی، ایک گڑھے میں۔ یہ زندگی جو ایک گڑھے میں شروع ہوئی اور ایک گڑھے میں ختم ہو گئی۔ یہ اکڑے اکڑے پاؤں جو ہمیشہ کیچڑ ہی میں چلتے رہے۔ یہ ہونٹ جنھیں کبھی دو وقت کھانا نہیں ملا۔ یہ کان جنھوں نے کبھی اقبال کا نغمہ نہیں سنا۔ یہ آنکھیں جو سدا خوبصورتی سے نا آشنا رہیں۔ کیوں ایسی مسلسل موت کو لوگ زندگی کہتے ہیں۔

اور اب یہ لاش کملاکر کا انتظار کر رہی تھی۔

ارے یہ تو شیدہ کی لاش ہے۔

شیدہ بریلی کا رہنے والا تھا۔ بمبئی کے لال باغ میں تیس برس سے مونگ پھلی بیچتا تھا۔ اتنا پرانا تھا وہ، کہ ٹرام والے اور مزدور اور دکاندار اور دیسی لوگ اور گجراتی سیٹھوں کے منیم اور سرخ رو پٹھان بھی اسے جانتے تھے۔ وہ اتنا پرانا تھا کہ جیسے بس کا اسٹینڈ یا کوٹر بریل کی گھڑی یا ایرانی کا ریسٹوران، لال باغ اس کے بغیر نامکمل تھا۔ مونگ پھلی بھونتے، تلتے اور اسے خوش اخلاقی سے بیچنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ اس کی زندگی ہندوؤں کے ساتھ بسر ہوئی تھی۔ انھیں کے ساتھ اس نے اپنا لڑکپن، اپنی جوانی اور اپنا بڑھاپا بسر کیا تھا اسی محلے میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ اور گجراتی سیٹھوں نے پانچسو روپے سے اس کی مدد کی تھی۔ اس علاقے میں اس کے بیوی بچے بے خوف و خطر گھومتے تھے۔ وہ لال باغ کی مخلوق تھے، اس کے ماحول کا حصہ تھے، اس کی خوشیوں، غموں کے وارث، وہ اسے چھوڑ کر کہاں جاسکتے تھے۔ جب فساد شروع ہوا تو بہتیرے مسلمانوں نے اس سے کہا کہ وہ لال باغ چھوڑ کر چلا جائے لیکن شیدہ نے ہنس کر ٹال دیا۔ میں اپنے بھائی ہندوؤں میں ہوں کوئی مجھے کیا کہے گا۔ ابھی دو روز ہوئے کملاکر نے بھی اس سے یہی کہا تھا۔ شیدہ میاں ہم تو ان مسلمانوں کے خلاف ہیں جنھوں نے ہمارے دیس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔ تم تو اپنے آدمی ہو تمھارا کوئی بال بیکا نہیں کرسکتا۔

کملاکر آگے بڑھ گیا۔ اس نے بورکر سے کہا "ارے اسے کیوں مارا؟"

بورکر نے کہا "کیا کرتا۔ اپنے علاقے میں اب یہی باقی رہ گیا تھا، اور مجھے پچاس روپوں کی ضرورت بھی تھی۔"

کملاکر نے جیب سے پچاس روپے نکال کر اسے دیے، سیٹھ اگلے ہفتے پچاس کر کچھیں

کرنے والے ہیں۔ کیونکہ سیٹھ بولتے تھے .... اب مسلمانوں کو مارنے والے بہتیرے آدمی مل رہے ہیں۔ میں نے کہا سیٹھ لال باغ میں دوسرے آدمی نہیں آسکتے اور میرے آدمی تو ایک مسلمان کے مارنے کے پچاس روپے لیں گے۔

پچاس روپے۔ رشید کا گھر۔ رشید کی بیوی۔ رشید کے بچے۔ پچاس روپے، پچاس روپے بھنی ہوئی مونگ پھلی کا کرکرا ذائقہ۔ بارش کی پھوار۔ رشید کی ملائم آواز، مونگ پھلی لے لو۔ .... پچاس روپے۔ ایک چھوٹا سا دیا۔ ایک چھوٹا سا ٹمٹماتا ہوا دیا۔ چار آنے میں صبح و شام کا کھانا۔ اللہ کا شکر۔ بچوں کے بھولے بھالے چہرے، بیوی کی نرم مہربان مسکراہٹ پچاس روپے۔ رات کی گرم لحاف میں فرش پر خاموشی سے سو جانا۔ بچوں کی سانسوں کی مدھم آوازیں۔ ننھے کے ملائم ہاتھ رشید کی داڑھی سے کھیلتے ہوئے، کھیلتے کھیلتے باپ کی آغوش میں سو جاتے ہوئے ..... پچاس روپے :....

کملاکر کے دماغ کے اندر کسی تہہ میں کہیں دور۔ اندر۔ گہری تہہ میں ایک لمحہ کے لیے ایک چبھن سی پیدا ہوئی اور پھر دوسرے لمحے میں مر گئی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ حورت سنگھ نے کہا ہسپتال کے پیچھے مزدوروں کے جھونپڑے ہیں ادھر....
سرکاری ہسپتال کے پیچھے کھلی زمین تھی اور تاڑ کے پیڑ تھے اور بہت عرصے سے ایک مارواڑی سوداگر اسے بیچنا چاہتا تھا۔ لیکن اس زمین کی قیمت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور وہ بے چارہ اس پریشانی میں تھا کہ اسے کب اور کیسے بیچے، جب اس نے یہ زمین خریدی تھی اس نے دو روپے گز کے حساب سے لی تھی۔ اور اب لوگ اس کے دس روپے گز دینے کے لیے تیار تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ اسے بیچ دے کہ دوسرے روز کسی دوسرے

سوداگر نے گیارہ روپے گز کے حساب سے زمین خریدنے کی بولی دی تیسرے روز بھاؤ بارہ روپے ہو گیا۔ بے چارہ مارواڑی بہت پریشان تھا کیا کرے۔ متواتر چھ سال سے وہ اسے بیچنا چاہ رہا تھا اور ابھی وجہ سے نہ بیچ سکا تھا کہ لوگ اس کے دام زیادہ ہی لگانے چلے جا رہے تھے، اس اثنا میں یہاں بلوچی خانہ بدوشوں کا قافلہ آکے آباد ہو گیا کشمیری مسلمان آئے جو لکڑیوں کے گودام پر کام کرتے تھے۔ ڈاک یارڈ کے دھوبی اور دھر سود خوار پٹھان جو اپنے میلے واسکوٹ میں روپے سینے سے لگائے سو روپے پر سو روپے سود لینے کے لیے مزدوروں اور کلرکوں، اور بے کار فلمی ادیبوں کی تلاش میں گھومتے تھے۔ اس قطعے میں خیمے لگے تھے اور چھپر اور کئی جگہ تو صرف درخت کے تنے سے تار کے پتوں کی چھت لگا دی گئی تھی کہ بارش میں بھیگنے سے بچ جائیں۔ فساد کے دوران میں یہ بستی آہستہ آہستہ خالی ہوتی گئی۔ اور اب تو چند دنوں سے بالکل ہی خالی پڑی تھی۔

کلاکر نے پوچھا۔ دھورت سنگھ ایسے ہاں تو اب کوئی نہیں رہتا۔

دھورت سنگھ نے کہا۔ وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ یہ دو کشمیری مسلمان آئے تھے میاں بیوی۔ اپنے کسی رشتہ دار کو پوچھتے ہوئے۔ مجھے لڑکوں نے بتایا۔ میں نے کہا اُدھر تمھیں ان سے ملا دوں۔ بس میں انھیں ادھر لے گیا۔ اور وہیں انھیں ختم کر دیا۔..... چلئے اُدھر تاڑ کے جھاڑ کی طرف۔

دو نوں نوجوان تھے۔ کپڑے میلے کچیلے، ہونٹوں پر حیرت اور ڈر، اور ایک ایسا انجان بھولپن جیسے اپنی موت کا یقین نہ آتا ہو۔ جیسے ان کی زندگیاں کہہ رہی ہوں، ہمیں یہاں مرنا نہیں ہے۔ ہم تو دکھ سے مر گئے ہیں۔ ہم شہد، زعفران اور سپید برف

کے دیس سے آئے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں آج سیب کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور مخملیں سبزے کا فرش ہے، اور آڑوؤں کے سرخ پھولوں کے گچھے لٹک رہے ہیں اور ناشپاتیوں کی شاخوں میں سبز چکنی چکنی پتیاں پھوٹ رہی ہیں۔ اور جہلم کا شفاف پانی نیلے پتھروں سے گزرتا ہوا گنگنا رہا ہے۔ ہمیں ہماری زندگیاں واپس دے دو۔ ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہمارا دیس کشمیر ہے۔

لڑکی کی نازک گردن میں شہ رگ پر زخم تھا اور اس کے ماتھے پر کشمیر کی صبح رو رہی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں پر پرائے دیس کی اوس تھی۔ اور اس کی نیلی آنکھوں کے حرف خاموش تھے۔ اور اس کا ہاتھ اپنے خاوند کے ہاتھ میں تھا۔ اور کشمیر کا شہزادہ اپنے صدیوں کے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا اپنی غربت اور نکبت اور یاس کے باوجود اس قتل گاہ کے خونیں تخت پر ایک عجیب تمکنت سے سوار تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنی بیوی کے ہاتھ میں تھا، اور دوسرا ہاتھ اکڑا ہوا ہاتھ ایک مجسم سوال بن کر فضا میں معلق تھا۔ اس کے جسم پر بہتیرے گھاؤ تھے۔ کیونکہ اس نے مدافعت کی کوشش کی تھی اور مرتے دم تک اپنی محبوبہ اپنی بیوی، اپنی زندگی کی عزت کو بچانا چاہا تھا۔ ایک ناکام کوشش، کشمیر ہر گیا تھا، اور دھان کے کھیت سوکھ گئے تھے۔ اور برف شرم سے اور خوف سے دھرتی میں سما گئی تھی۔ اور وہ اکڑا ہوا ہاتھ کہہ رہا تھا، ظالمو! تم نے مسلمان کو نہیں مارا ہے۔ تم نے انسان کو مارا ہے۔ تم نے ہندستان کو مارا ہے۔ تم نے تاج محل، فتح پور سیکری اور شالا مار کو قتل کیا ہے۔ یہ اشوک کی لاش ہے۔ یہ اکبر کا کفن ہے، یہ پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کا مردہ ہے۔ یہ مردود سیاست داں ہندو اور مسلمان یہ سامنتی جاگیر دار، یہ فریبی سرمایہ دار۔ کس کے خون سے اور کس کی بربادی سے

اپنی حکومتیں تعمیر کر رہے ہیں۔

کملاکر نے ہنس کر کہا۔ بڑے ٹھاٹ سے آئے تھے اپنے کسی رشتہ دار سے ملنے کے لیے۔ معلوم نہیں تھا یہاں دادا کملاکر سے ملاقات ہوگی۔ کملاکر کے گرگے ہنسنے لگے۔

کچھ توقف کے بعد کملاکر نے جیب سے سو روپے کے نوٹ نکال کے دھورت سنگھ کو دیے اور اس سے کہا۔ ان لاشوں کو ٹھکانے لگا دو۔

. . . .

شام کے اخبار ہند میں کملاکر نے پڑھا۔ آج بمبئی میں بالکل امن رہا۔ اگری پاڑہ، گول پیٹھا۔ ڈونگری۔ کالبا دیوی۔ بھنڈی بازار۔ کہیں کوئی واردات نہیں ہوئی۔ صرف لال باغ میں چاقوزنی کی چار وارداتیں ہوئیں۔ باقی سب جگہ امن ہے۔

کملاکر نے مسکرا کر اخبار کو تہہ کر کے پان والے کو دے دیا۔ اور اس سے کہا۔ ایک بنڈل شیر مارکہ بیڑی کا دے دو۔ اور یہ ہے تمھاری کوکین!

ایک طوائف کا خط

پنڈت جواہر لال نہرو اور قائداعظم جناح کے نام

مجھے امید ہے کہ اس سے پہلے آپ کو کسی طوائف کا خط نہ ملا ہوگا۔ یہ بھی امید کرتی ہوں کہ آج تک آپ نے میری اور اس قماش کی دوسری عورتوں کی صورت بھی نہ دیکھی ہوگی، یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کو میرا یہ خط لکھنا کس قدر معیوب ہے، اور وہ بھی ایسا کھلا خط، مگر کیا کروں حالات کچھ ایسے ہیں اور ان دونوں لڑکیوں کا تقاضا اتنا شدید ہے کہ میں یہ خط لکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ خط میں نہیں لکھ رہی ہوں، یہ خط مجھ سے بیلا اور بتول لکھوا رہی ہیں۔ اس لیے مجھے معاف کیجئے گا۔ ایک گری ہوئی عورت آپ کو اس بے باکی سے خط لکھ رہی ہے۔ میں صدق دل سے معافی چاہتی ہوں، اگر میرے خط میں کوئی فقرہ آپ کو ناگوار گزرے۔ اسے میری مجبوری پر محمول کیجئے گا۔

بیلا اور بتول مجھ سے یہ خط کیوں لکھوا رہی ہیں۔ یہ دونوں لڑکیاں کون ہیں، اور ان کا تقاضا اس قدر شدید کیوں ہے۔ یہ سب کچھ بتانے سے پہلے میں آپ کو اپنے متعلق کچھ بتانا چاہتی ہوں، گھبرائیے نہیں، میں آپ کو اپنی گھناؤنی زندگی کی تاریخ سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی۔ میں یہ بھی نہیں بتاؤں گی کہ میں کب اور کن حالات میں طوائف بنی۔ میں کسی

شریفانہ جذبے کا سہارا لے کر آپ سے کسی جھوٹے رحم کی درخواست کرنے نہیں آئی ہوں۔ میں آپ کے دردمند دل کو پہچان کر اپنی صفائی میں جھوٹا افسانہ محبت نہیں گھڑنا چاہتی۔ اس خط کے لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو طوائفیت کے اسرار ورموز سے آگاہ کردوں۔ مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا ہے، میں صرف اپنے متعلق چند ایسی باتیں بتانا چاہتی ہوں جن کا آگے چل کر بیلا اور بتول کی زندگی پر اثر پڑ سکتا ہے۔

آپ لوگ کئی بار بمبئی آئے ہوں گے۔ جناح صاحب نے تو بمبئی کو بہت دیکھا ہے مگر آپ نے ہمارا بازار کا ہے کو دیکھا ہوگا۔ جس بازار میں میں رہتی ہوں وہ فارس روڈ کہلاتا ہے، فارس روڈ، گرانٹ روڈ اور مدن پورہ کے بیچ میں واقع ہے، گرانٹ روڈ کے اس پار ملنگٹن روڈ، اور اوپیرا ہاؤس اور چوپاٹی۔ میرین ڈرائیو اور فورٹ کے علاقے ہیں۔ جہاں بمبئی کے شرفا رہتے ہیں۔ مدن پورہ میں اس طرف غریبوں کی بستی ہے۔ فارس روڈ ان دونوں کے بیچ میں ہے تاکہ امیر اور غریب اس سے یکساں مستفید ہو سکیں۔ گو فارس روڈ پھر بھی مدن پورہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ ناداری میں اور طوائفیت میں ہمیشہ بہت کم فاصلہ رہتا ہے۔

یہ بازار بہت خوبصورت نہیں ہے، اس کے مکین بھی خوبصورت نہیں ہیں اس کے بیچوں بیچ ٹرام کی گڑگڑاہٹ شب و روز جاری رہتی ہے۔ جہاں بھر کے آوارہ کتے اور لونڈے اور شہدے اور بے کار اور جرائم پیشہ مخلوق اس کی گلیوں کا طواف کرتی نظر آتی ہے۔ لنگڑے، لولے، اوباش، مدقوق تماش بین۔ آتشک و سوزاک کے مارے ہوئے کانے، لنجے، کوکین باز اور جیب کترے اس بازار میں سینہ تان کر چلتے ہیں، غلیظ ہوٹل، سیلے ہوئے فٹ پاتھ پر میلے کے ڈھیروں پر بھنبھناتی ہوئی لاکھوں

مکھیاں۔ لکڑیوں اور کوئلوں کے افسردہ گودام۔ پیشہ ور دلال اور پان بیچنے والے۔ کوک شاستر اور ننگی تصویروں کے دکان دار، چینی حجام اور اسلامی حجام، اور لنگوٹے کس کر گالیاں بکنے والے پہلوان۔ ہماری سماجی زندگی کا سارا کوڑا کرکٹ آپ کو فارس روڈ پر ملتا ہے۔ ظاہر ہے آپ یہاں کیوں آئیں گے۔ کوئی شریف آدمی ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ شریف آدمی جتنے ہیں وہ گرانٹ روڈ کے اس پار رہتے ہیں۔ اور جو بہت ہی شریف ہیں وہ ملابار ہل پر قیام کرتے ہیں۔ میں ایک بار جناح صاحب کی کوٹھی کے سامنے سے گزری تھی اور وہاں میں نے جھک کر سلام بھی کیا تھا۔ بتول بھی میرے ساتھ تھی۔ بتول کو آپ سے (جناح صاحب) جس قدر عقیدت ہے اس کو میں بیان ٹھیک طرح سے بیان نہ کر سکوں گی۔ خدا اور رسول کے بعد دنیا میں اگر وہ کسی کو چاہتی ہے تو حضرت وہ آپ ہیں۔ اس نے آپ کی تصویر لاکٹ میں لگا کر اپنے سینے سے لگا رکھی ہے۔ کسی بُری نیت سے نہیں۔ بتول کی عمر ابھی گیارہ برس کی ہے، چھوٹی سی لڑکی ہی تو ہے وہ۔ گو فارس روڈ والے ابھی سے اس کے متعلق بُرے بُرے ارادے کر رہے ہیں مگر خیر وہ کبھی پھر آپ کو بتاؤں گی۔

تو یہ ہے فارس روڈ جہاں میں رہتی ہوں، فارس روڈ کے مغربی سرے پر جہاں چینی حجام کی دکان ہے، اس کے قریب ایک اندھیری گلی کے موڑ پر میری دکان ہے۔ لوگ تو اسے دکان نہیں کہتے۔ مگر خیر آپ دانا ہیں آپ سے کیا چھپاؤں گی، یہی کہوں گی وہاں پر میری دکان ہے اور وہاں پر میں اس طرح بیوپار کرتی ہوں جس طرح بنیا، سبزی والا، پھل والا، ہوٹل والا، موٹر والا، سینما والا، کپڑے والا یا کوئی اور دکاندار بیوپار کرتا ہے، اور ہر بیوپار میں گاہک کو خوش کرنے کے علاوہ اپنے فائدہ کی بھی سوچتا ہے۔ میرا بیوپار بھی اسی طرح کا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ میں بلیک مارکٹ نہیں کرتی۔ اور مجھ میں اور دوسرے بیوپاریوں میں کوئی فرق نہیں۔

یہ دکان اچھی جگہ پر واقع نہیں ہے۔ یہاں رات تو کیا دن میں بھی لوگ ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اس اندھیری گلی میں لوگ اپنی جیبیں خالی کر کے جاتے ہیں۔ شراب پی کر تے کرتے ہیں۔ جہان بھر کی گالیاں بکتے ہیں۔ یہاں بات بات پر چھرا زنی ہوتی ہے۔ دو ایک خون دوسرے تیسرے روز ہوتے رہتے ہیں۔ غرضکہ ہر وقت جان ضیق میں رہتی ہے۔ اد ہر میں کوئی اچھی طوائف نہیں ہوں کہ لوپن پر جا کے رہوں یا ورلی پر سمندر کے کنارے ایک کوٹھی لے سکوں۔ میں ایک بہت ہی معمولی درجے کی طوائف ہوں، اور گو میں نے سارا ہندستان دیکھا ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور ہر طرح کے لوگوں کی صحبت میں بیٹھی ہوں، لیکن اب دس سال سے اسی شہر بمبئی میں۔ اسی فارس روڈ پر۔ اسی دکان میں بیٹھی ہوں۔ اور اب تو مجھے اس دکان کی پگڑی بھی چھ ہزار روپے تک ملتی ہے۔ حالاں کہ یہ جگہ کوئی اتنی اچھی نہیں۔ فضا متعفن ہے۔ کیچڑ چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ گندگی کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اور خارش زدہ کتے گھبرائے ہوئے گاہکوں کی طرف کاٹ کھانے کو لپکتے ہیں۔ پھر بھی مجھے اس جگہ کی پگڑی چھ ہزار روپے تک ملتی ہے۔

اس جگہ میری دکان ایک منزلہ مکان میں ہے۔ اس کے دو کمرے ہیں۔ سامنے کا کمرہ میری بیٹھک ہے۔ یہاں میں گاتی ہوں، ناچتی ہوں، گاہکوں کو رجھاتی ہوں، پیچھے کا کمرہ، باورچی خانے اور غسل خانے اور سونے کے کمرے کا کام دیتا ہے۔ یہاں ایک طرف نل ہے۔ ایک طرف ہنڈیا ہے۔ اور ایک طرف ایک بڑا سا پلنگ ہے اور اس کے نیچے ایک اور چھوٹا سا پلنگ ہے، اور اس کے نیچے میرے کپڑوں کے صندوق ہیں، باہر والے کمرے میں بجلی کی روشنی ہے لیکن اندر والے کمرے میں بالکل اندھیرا ہے۔ مالک مکان نے برسوں سے قلعی نہیں کرائی نہ وہ کرائے گا۔ اتنی فرصت کسے ہے۔ میں تو رات بھر ناچتی

گاتی ہوں اور دن کو وہیں گاؤ تکیے پر سر ٹیک کر سو جاتی ہوں، بیلا اور بتول کو پیچھے کا کمرہ دے رکھا ہے۔ اکثر گاہک جب ادھر منہ ہاتھ دھونے کے لیے جاتے ہیں تو بیلا اور بتول بھی ٹم ٹم نگاہوں سے انھیں دیکھنے لگ جاتی ہیں۔ جو کچھ ان کی نگاہیں کہتی ہیں میرا یہ خط بھی وہی کہتا ہے۔ اگر وہ میرے پاس اس وقت نہ ہوتیں تو یہ گناہگار بندی آپ کی خدمت میں یہ گستاخی نہ کرتی۔ جانتی ہوں دنیا مجھ پر تھو تھو کرے گی۔ جانتی ہوں شاید آپ تک میرا یہ خط بھی نہ پہونچے گا۔ پھر بھی مجبور ہوں۔ یہ خط لکھ کے رہوں گی کہ بیلا اور بتول کی مرضی یہی ہے۔

شاید آپ قیاس کر رہے ہوں کہ بیلا اور بتول میری لڑکیاں ہیں۔ نہیں یہ غلط ہے میری کوئی لڑکی نہیں ہے۔ ان دونوں لڑکیوں کو میں نے بازار سے خریدا ہے۔ جن دنوں ہندو مسلم فساد زوروں پر تھا۔ اور گرانٹ روڈ۔ اور فارس روڈ اور مدن پورہ پر انسانی خون پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ ان دنوں میں نے بیلا کو ایک مسلمان دلّال سے تین سو روپے کے عوض خریدا تھا۔ یہ مسلمان دلال اس لڑکی کو دہلی سے لایا تھا جہاں بیلا کے ماں باپ رہتے تھے۔ بیلا کے ماں باپ راولپنڈی میں راجہ بازار کے عقب میں پونچھ ہاؤس کے سامنے کی گلی میں رہتے تھے۔ متوسط طبقے کا گھرانہ تھا، شرافت اور سادگی گھٹی میں پڑی تھی۔ بیلا اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اور جب راولپنڈی میں مسلمانوں نے ہندوؤں کو تہ تیغ کرنا شروع کیا اس وقت چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ یہ بارہ جولائی کا واقعہ ہے۔ بیلا اپنے اسکول سے پڑھ کر گھر آ رہی تھی کہ اس نے اپنے گھر کے سامنے اور دوسرے ہندوؤں کے گھروں کے سامنے ایک جم غفیر دیکھا۔ یہ لوگ مسلح تھے اور گھروں کو آگ لگا رہے تھے اور لوگوں کو اور ان کے بچوں کو اور ان کی عورتوں کو گھر سے باہر نکال کر

انھیں قتل کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اللہ اکبر کا نعرہ بھی بلند کرتے جاتے تھے۔ بیلا نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا پھر اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ وحشی مسلمانوں نے اس کے پستان کاٹ کر پھینک دیئے تھے وہ پستان جن سے ایک ماں کوئی ماں، ہندو ماں، یا مسلمان ماں، عیسائی ماں، یا یہودی ماں۔ اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ اور انسانوں کی زندگی میں کائنات کی وسعت میں تخلیق کا ایک نیاباب کھولتی ہے۔ وہ دودھ بھرے پستان اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ کاٹ ڈالے گئے کسی نے تخلیق کے ساتھ اتنا ظلم کیا تھا کسی ظالم اندھیرے نے ان کی روحوں میں یہ سیاہی بھر دی تھی۔ میں نے قرآن پڑھا ہے اور میں جانتی ہوں کہ راولپنڈی میں بیلا کے ماں باپ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اسلام نہیں تھا، وہ انسانیت نہ تھی، وہ دشمنی بھی نہ تھی۔ وہ انتقام بھی نہ تھا، وہ ایک ایسی سفاکی، بے رحمی، بزدلی اور شیطنت تھی جو تاریکی کے سینے سے پھوٹتی ہے اور نور کی آخری کرن کو بھی داغدار کر جاتی ہے۔

بیلا اب میرے پاس ہے۔ مجھ سے پہلے وہ داڑھی والے مسلمان دلال کے پاس تھی بیلا کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی جب وہ چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ اپنے گھر میں ہوتی تو آج پانچویں جماعت میں داخل ہو رہی ہوتی۔ پھر بڑی ہوتی تو اس کے ماں باپ اس کا بیاہ کسی شریف گھرانے کے غریب سے لڑکے سے کر دیتے، وہ اپنا چھوٹا سا گھر بساتی اپنے خاوند سے۔ اپنے ننھے ننھے بچوں سے، اپنی گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے۔ لیکن اس نازک کلی کو بے وقت خزاں آگئی۔ اب بیلا بارہ برس کی نہیں معلوم ہوتی۔ اس کی عمر تھوڑی ہے لیکن اس کی زندگی بہت بوڑھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں جو ڈر ہے۔ انسانیت کی جو تلخی ہے۔ یا اس کا جو لہو ہے۔ موت کی جو پیاس ہے۔ قائد اعظم صاحب

شاید اگر آپ اسے دیکھ سکیں تو اس کا اندازہ کر سکیں ۔ ان بے آسرا آنکھوں کی گہرائیوں میں اتر سکیں ۔ آپ تو شریف آدمی ہیں ۔ آپ نے شریف گھرانے کی معصوم لڑکیوں کو دیکھا ہوگا ہندو لڑکیوں کو، مسلمان لڑکیوں کو، شاید آپ سمجھ جاتے کہ معصومیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ۔ وہ ساری انسانیت کی امانت ہے ، ساری دنیا کی میراث ہے جو اسے مٹاتا ہے اسے دنیا کے کسی مذہب کا کوئی خدا معاف نہیں کر سکتا ۔

بتول اور بیلا دونوں سگی بہنوں کی طرح میرے ہاں رہتی ہیں ۔ بتول اور بیلا سگی بہنیں نہیں ہیں ۔ بتول مسلمان لڑکی ہے ۔ بیلا نے ہندو گھر میں جنم لیا ۔ آج دونوں فارس روڈ پر ایک رنڈی کے گھر میں بیٹھی ہیں ۔ اگر بیلا راولپنڈی سے آئی ہے تو بتول جالندھر کے ایک گاؤں کھیم کرن کے ایک پٹھان کی بیٹی ہے ۔ بتول کے باپ کی سات بیٹیاں تھیں ، تین شادی شدہ اور چار کنواریاں ، بتول کا باپ کھیم کرن میں ایک معمولی کاشتکار تھا ۔ غریب پٹھان لیکن غیور پٹھان جو صدیوں سے کھیم کرن میں آ کے بس گیا تھا ۔ جاٹوں کے اس گاؤں میں بس تین چار گھر پٹھانوں کے تھے ، یہ لوگ حسن حلم و آشتی سے رہتے تھے شاید اس کا اندازہ پنڈت جی آپ کو اس امر سے ہوگا کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی ان لوگوں کو اپنے گاؤں میں مسجد بنانے کی اجازت نہ تھی ۔ یہ لوگ گھر میں چپ چاپ اپنی نماز ادا کرتے ، صدیوں سے جب سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے عنان حکومت سنبھالی تھی کسی مومن نے اس گاؤں میں اذان نہ دی تھی ۔ ان کا دل عرفان سے روشن تھا لیکن دنیاوی مجبوریاں اس قدر شدید تھیں اور پھر رواداری کا خیال اس قدر غالب تھا کہ لب وا کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی ۔

بتول اپنے باپ کی چہیتی لڑکی تھی ۔ ساتوں میں سب سے چھوٹی ، سب سے پیاری ،

سب سے حسین، بتول اس قدر حسین ہے کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہوتی ہے، پنڈت جی آپ تو خود کشمیری النسل ہیں اور فن کار ہو کر یہ بھی جانتے ہیں کہ خوبصورتی کسے کہتے ہیں۔ یہ خوبصورتی آج میری گندگی کے ڈھیر میں گڈمڈ ہو کر اس طرح پڑی ہے کہ اس کا پرکھ کرنے والا کوئی شریف آدمی اب مشکل سے ملے گا۔ اس گندگی میں گلے سڑے مارواڑی گھنی مونچھوں والے ٹھیکیدار۔ ناپاک نگاہوں والے چوربازاری ہی نظر آتے ہیں۔ بتول بالکل ان پڑھ ہے۔ اس نے صرف جناح صاحب کا نام سنا تھا، پاکستان کو ایک اچھا تماشہ سمجھ کر اس کے نعرے لگائے تھے۔ جیسے تین چار برس کے ننھے بچے گھر میں انقلاب زندہ باد، کرتے پھرتے ہیں، گیارہ برس ہی کی تو وہ ہے۔

ان پڑھ بتول۔ وہ چند دن ہوا ہوئے میرے پاس آئی ہے، ایک ہندو دلال اسے میرے پاس لایا تھا۔ میں نے اسے پانچ سو روپے میں خرید لیا۔ اس سے پہلے وہ کہاں تھی یہ میں نہیں کہہ سکتی، ہاں لیڈی ڈاکٹر نے مجھ سے بہت کچھ کہا ہے، کہ اگر آپ اسے سن لیں تو شاید پاگل ہو جائیں۔ بتول بھی اب نیم پاگل ہے۔ اس کے باپ کو جاٹوں نے اس بیدردی سے مارا ہے کہ ہند و تہذیب کے پچھلے چھ ہزار برس کے چھلکے اتر گئے ہیں۔ اور انسانی بربریت اپنے وحشی ننگے روپ میں سب کے سامنے آگئی ہے۔ پہلے تو جاٹوں نے اس کی آنکھیں نکال لیں۔ پھر اس کے منہ میں پیشاب کیا، پھر اس کے حلق کو چیر کر اس کی آنتیں تک نکال ڈالیں۔ پھر اس کی شادی شدہ بیٹیوں سے زبردستی منہ کالا کیا۔ اسی وقت ان کے باپ کی لاش کے سامنے۔ ریحانہ۔ گل درخشاں۔ مرجانہ۔ سوسن۔ بیگم، ایک ایک کر کے وحشی انسان نے اپنے مندر کی مورتیوں کو ناپاک کیا۔ جس نے انھیں زندگی عطا کی، جس نے انھیں لوریاں سنائی تھیں، جس نے ان کے سامنے شرم اور عجز سے اور پاکیزگی سے سر

جھکایا تھا۔ ان تمام بہنوں، بہوؤں اور ماؤں کے ساتھ زنا کیا۔ ہندو دھرم نے اپنی عزت کھو دی تھی، اپنی رواداری تباہ کر دی تھی۔ اپنی عظمت مٹا ڈالی تھی۔ آج رگ وید کا ہر منتر خاموش تھا۔ آج گرنتھ صاحب کا ہر ورد شرمندہ تھا۔ آج گیتا کا ہر اشلوک زخمی تھا۔ کون ہے جو میرے سامنے اجنتا کی مصوری کا نام لے سکتا ہے۔ اشوک کے کتبے سنا سکتا ہے، ایلورا کے صنم زاروں کے گن گا سکتا ہے۔ بتول کے بے بس بھینچے ہوئے ہونٹوں، اس کی بانہوں پر وحشی درندوں کے دانتوں کے نشان اور اس کی بھری ہوئی ٹانگوں کی ناہمواری میں تمھاری اجنتا کی موت ہے۔ تمھارے ایلورا کا جنازہ ہے۔ تمھاری تہذیب کا کفن ہے۔ آؤ، آؤ میں تمھیں اس خوبصورتی کو دکھاؤں جو کبھی بتول تھی۔ اس متعفن لاش کو دکھاؤں جو آج بتول ہے۔

جذبے کی رو میں بہہ کر میں بہت کچھ کہہ گئی، شاید یہ سب مجھے نہ کہنا چاہیے تھا، شاید اس میں آپ کی ہتک ہے۔ شاید اس سے زیادہ ناگوار باتیں آپ سے اب تک کسی نے نہ کہی ہوں نہ سنائی ہوں گی۔ شاید آپ یہ سب کچھ نہیں کر سکتے، شاید تھوڑا بھی نہیں کر سکتے، پھر بھی ہمارے ملک میں آزادی آگئی ہے۔ ہندستان میں اور پاکستان میں۔ اور شاید ایک طوائف کو بھی اپنے رہنماؤں سے پوچھنے کا یہ حق ضرور ہے کہ اب بیلا اور بتول کا کیا ہوگا؟

...... بیلا اور بتول دو لڑکیاں ہیں۔ دو قومیں ہیں۔ دو تہذیبیں ہیں۔ دو مندر اور مسجد ہیں۔ بیلا اور بتول آج کل فارس روڈ پر ایک رنڈی کے ہاں رہتی ہیں جو چینی حجام کی بغل میں اپنی دکان کا دھندا چلاتی ہے۔ بیلا اور بتول کو یہ دھندا پسند نہیں ہے میں نے انھیں خریدا ہے۔ میں چاہوں تو ان سے یہ کام لے سکتی ہوں لیکن میں سوچتی ہوں میں یہ کام نہیں کروں گی جو راولپنڈی اور جالندھر نے ان سے کیا ہے۔ میں نے انھیں اب تک فارس روڈ کی دنیا سے الگ تھلگ رکھا ہے۔ پھر بھی جب میرے گاہک پچھلے کمرے میں جا کر

اپنا منہ بات دھونے لگتی ہیں اس وقت بیلا اور بتول کی نگاہیں مجھ سے کچھ کہنے لگتی ہیں۔ مجھے ان نگاہوں کی تاب نہیں۔ میں ٹھیک طرح سے ان کا سندیسہ بھی آپ تک نہیں پہنچا سکتی ہوں۔ آپ کیوں نہ خود ان نگاہوں کا پیغام پڑھ لیں۔ پنڈت جی میں چاہتی ہوں کہ آپ بتول کو اپنی بیٹی بنالیں، جناح صاحب میں چاہتی ہوں کہ آپ بیلا کو اپنی دختر نیک اختر سمجھیں۔ ذرا ایک دفعہ انھیں اس فارس روڈ کے جنگل سے چھڑا کے اپنے گھر میں رکھئے۔ اور ان لاکھوں روحوں کا نوحہ سنئے، یہ نوحہ جو نوا کھالی سے راولپنڈی تک اور بھرت پور سے بمبئی تک گونج رہا ہے۔ کیا صرف گورنمنٹ ہاؤس میں اس کی آواز سنائی نہیں دیتی، یہ آواز سنیں گے آپ؟۔

آپ کی مخلص

فارس روڈ کی ایک طوائف

جیکسن

رات جوان تھی۔ اور یخ کی طرح سرد اور سخت، سڑک بھی سخت تھی اور جیکسن کے بھاری جوتوں کی چاپ بھی سخت تھی۔ اور سڑک کے دو رویہ درخت بھی پولیس کے سنتریوں کی طرح اکڑے ہوئے کھڑے نظر آ رہے تھے۔ اسی رات میں، اسی آسمان تلے، اسی سڑک کے آر پار، ہر چیز سخت، واضح اور متعین تھی، مثال کے طور پر جیکسن کو معلوم تھا کہ وہ شہر لاہور کا سپرنٹنڈنٹ پولیس ہے جس سڑک پر وہ چل رہا ہے وہ امپریس روڈ کہلاتی ہے۔ وہ کلب سے چھ پیگ پی کر چھڑی گھماتا ہوا اپنے بنگلے کو جا رہا ہے، پولیس کے چار سپاہی اس کے عقب میں آ رہے ہیں تاکہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔ خود اس کی جیب میں ایک بھرا ہوا پستول ہے۔ اس نے اس ملک میں بیس سال نوکری کی ہے۔ اور اب پندرہ اگست ۱۹۴۷ء میں صرف چار روز باقی رہ گئے ہیں۔ جب یہ ملک آزاد ہو جائے گا اور جیکسن کی بادشاہت اس سے چھن جائے گی۔

جیکسن گو اینگلو انڈین تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو صرف انگریز ہی سمجھتا تھا۔

اس لیے بادشاہت چھن جانے کا اسے بے حد ملال تھا۔ اس نے اس ملک میں بیس سال بادشاہت کی تھی۔ اس دو سو سال کی بادشاہت میں بیس سال کے سامراجی اقتدار کا ایک حصہ اس کی زندگی میں بھی آیا تھا۔ وہ پنجاب کے ہر ضلع میں رہ چکا تھا اور ہر ضلع میں ایک بنگلہ، آٹھ نوکر، بیسوں تھانے دار، حوالدار، اور انسپکٹر اور سپاہی اور ہزاروں لاکھوں افراد پر مشتمل مخلوق اس کے تصرف میں ہوتی تھی۔ بیس سال تک اس نے اس ملک میں بادشاہت کی تھی۔

اب پندرہ اگست کو یہ بادشاہت ختم ہو جائے گی۔ یہ تاریخ اس کے حافظے میں اس طرح گڑی ہوئی تھی جیسے اس کے بھاری بھرکم جوتے کے تلوے میں لوہے کی کیل یا جیسے رات کی سیاہ آہنی چادر میں نیلے ستارے۔ آج ہر چیز سخت، واضح اور متعین تھی۔ اپنی جگہ پر ٹھوس قائم بالذات، اس کا فیصلہ بھی اتنا ہی سخت، ٹھوس اور واضح اور اپنی جگہ پر اٹل تھا۔ وہ بہار دو سال اور ملازمت کرے گا۔ پھر اپنے وطن انگلستان کو لوٹ جائے گا۔ ہندستان اس کا وطن نہ تھا اس نے بہت سختی سے اپنے دل و دماغ کو یہ بات جتادی کہ وہ ہندستانی نہیں ہے۔ وہ صرف انگریز ہے اور اسے انگلستان واپس جانا ہے اور اس کے دل و دماغ نے پولیس کے سنتریوں کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اب وہ دو سال کے بعد انگلستان واپس جائے گا۔ اس نے بارک شائر میں ایک کاٹیج اور ایک ڈیری فارم بھی خرید لیا ہے۔ اب دو سال کے بعد وہ پنشن لے کر بارک شائر میں اپنی بیوی اور دو لڑکیوں کے ساتھ رہے گا۔ نہ کوئی جھنجھٹ نہ تکلیف نہ مصیبت۔ اس کی بیوی بھی۔ اور دو لڑکیاں، بڑی کا نام سنتھیا تھا۔ اور چھوٹی کا روزی، اور دونوں برٹ کے تاج گھر کی زینت سمجھی جاتی تھیں۔ کئی اینگلو انڈین لڑکوں نے شادی کی درخواست کی لیکن لڑکیوں نے انکار کر دیا۔ وہ تو صرف خالص انگریز سے شادی کریں گی، اور وہ بھی اچھے گھرانے کے کسی انگریز سے۔

یہ تمامی واہی بھی انھیں پسند نہ تھے۔ نہ وہ دوسری اینگلو انڈین چھوکریوں کی طرح ان کے ساتھ گھومتی تھیں، اپنے خیالات میں، اپنے اطوار میں اور اپنے عمل میں دونوں لڑکیاں اپنے باپ کی طرح سخت اور برفیلی تھیں۔ اور باپ کو اس کا علم تھا۔ اور جتنی کہ اپنی لڑکیوں سے جتنی محبت بھی اتنی شاید اسے اپنی بادشاہت سے بھی نہ تھی۔ بالخصوص روزی کو تو وہ بہت چاہتا تھا۔ روزی اتنی خوبصورت تھی کہ انگلستان کے کسی بڑے لارڈ سے بیاہے جانے کے قابل تھی۔ ناچنے میں ہمیشہ اول نمبر کا انعام حاصل کرتی، مقابلہ حسن میں ہمیشہ ملکہ چنی جاتی، اپنی جماعت میں سب لڑکیوں سے زیادہ نمبر حاصل کرتی۔ گانے میں۔ پیانو بجانے میں تصویر کشی میں۔ موٹر چلانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ یہ سب اوصاف سنتھیا میں بھی موجود تھے جو روزی کی بڑی بہن تھی۔ لیکن ذرا کم، ذرا ماند، ذرا کم ور، سے، قدرتی جوہر میں جو ایک فطری چمک اور جلا ہوتی ہے۔ اس سے سنتھیا محروم تھی، ہاں ایک بات میں وہ روزی سے کم نہیں زیادہ ہی آگے تھی یعنی ہندستانیوں سے نفرت کرنے میں، روزی کو ہندستانیوں سے ایسے ہی نفرت تھی۔ ایک لاابالی انجان سی نفرت۔ جیسے اسے مچھلی کھانے سے نفرت تھی۔ یوں ہی یا اس نے جیسے بائبل میں شیطان کے بارے میں پڑھا تھا۔ اسی طرح اس کے ابا اور امی نے اسے ہندستانیوں کے بارے میں بتایا تھا۔ اسے بسا اوقات ہندستانی شیطان کی طرح دلچسپ معلوم ہوتے، وہ ان کے متعلق اپنے والد سے قصے سنا کرتی۔ یہ قصے اس کے لیے الف لیلہ سے کم پراسرار نہ تھے، ڈاکوؤں کے قصے، جاٹوں کی خوں ریزی کے قصے، عورتوں کو بھگا لے جانے کے افسانے، جیب کترنے، چوری کرنے اور ناجائز شراب کشید کرنے کے قصے، ہندستانی افسر جو رشوت لیتے تھے، اور ہندستانی سیٹھ جو نفع اندوزی اور چور بازار کا دھندا چلاتے تھے۔ روزی کو بڑی حیرت ہوتی تھی، یہ باتیں سن کر اس کی زندگی، اسکول اور برٹ کے ناچ گھر اور پک نک اور ٹینس

تک محدود تھی ۔ اس میں خوبصورت لڑکے لڑکیاں تھے ۔ جوانی کی اچھل کود تھی ۔ ٹینس کے تھرکتے ہوئے گیند تھے اور کبھی کبھی چاندنی راتوں میں برٹ کے سایہ دار گھنے درختوں تلے چلتے چلتے کمر میں ہاتھ ڈال کر سانس روک کر ایسے پیارے لطیف بوسے تھے جو صرف چاندنی سے بنے تھے ۔ صرف جنت سے آئے تھے ، اور شہد کی سی حلاوت رکھتے تھے ۔ اور دوسرے لمحے تیتری کی طرح ہوا میں گم ہو جاتے تھے ، صرف ان کی خوشبو باقی رہتی تھی ۔ اور دیر تک دماغ کی تہوں میں تیرتی رہتی تھی ۔ یہ زندگی ہندوستانیوں کی زندگی سے کس قدر مختلف تھی ۔ کبھی کبھی نفرت کرتے ہوئے بھی روزی کا جی چاہتا کہ وہ کسی ہندوستانی سے بات کرے ۔ بات کرنے کو تو یوں اسے کئی ہندوستانی ملے تھے ، لیکن وہ سب اینگلو انڈین تہذیب کے نقال تھے اور روزی کو نقلی چیزیں پسند نہ تھیں ، بلکہ وہ لوگ تو اسے اور بھی بُرے لگتے ، اور وہ ایک سرسری ملاقات کے بعد ان سے ہیلو تک کی واقفیت بھی نہ رکھتی تھی ۔ اور سنتھیا تو اتنی راسخ الاعتقاد تھی کہ آج تک کسی ہندوستانی مرد کے ساتھ وہ ناچی بھی نہ تھی ۔ اور اس قدر محتاط تھی وہ کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے دور پار کے دوستوں میں بھی کوئی ایک ہندوستانی ہوگا ۔ اسے اپنے اینگلو انڈین ہونے کا شدید احساس تھا ۔ اور اپنے کھلتے ہوئے صبیح حسن کے باوجود جب اسے یوروپین لوگ اینگلو انڈین سمجھتے تو وہ اپنے مقدس اینگلوسکسن خون میں ہندوستانی ملاوٹ کو صلواتیں سنانے لگتی ، یہ کمبخت ہندوستانی ہر چیز میں ملاوٹ کرتے ہیں ۔ دودھ میں ، شکر میں ، کپڑے میں ، اناج میں ، ہر چیز میں ملاوٹ ، حتیٰ کہ سنتھیا کے خون میں بھی انھوں نے یہ گندی ملاوٹ کر دی تھی ۔ ڈیم سوائنش ۔

جیکسن نے اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ تربیت دی تھی ۔ اور بُرے ماحول سے بچا بچا کے اس لیے رکھا تھا کہ وہ انگلینڈ کے لیے محفوظ رہیں اور ان کے رکھ رکھاؤ میں اسی اجانج

پڑتال سے کام لیتا تھا جس طرح وہ دوسرے سامراجی کاموں میں، یعنی انگلینڈ کا فائدہ ہر حالت میں ملحوظ خاطر رہے۔ یہ لڑکیاں اس کے لیے فلسطین کے مینڈیٹ سے کم نہ تھیں اور اپنے ذہن کی تختی پر اس نے اپنی دونوں بیٹیوں کے بارے میں نہایت جلی حروف سے Reserved for England کے لیے محفوظ لکھ رکھا تھا۔ وہ جب بھی اپنی بیٹیوں سے بات کرتا یا انہیں دیکھتا یا ان کے متعلق سوچتا تو تختی کے یہ حروف اس کے دماغ میں یوں چمکنے لگتے، جیسے رات کے اندھیرے میں پٹرول پمپ پر کالٹیکس کا اشتہار بجلی کے قمقمے روشن ہوتے گل ہو جاتے روشن ہوتے گل ہو جاتے Reserved for England اندھیرا Reserved for England اُجالا۔

اس وقت بھی جیکسن اپنے اور اپنی بیٹیوں کے اور اپنے یارک شائر کے خوبصورت گھر کے بارے میں پختہ ارادے باندھتا ہوا امیر بس روڈ سے جا رہا تھا۔ ہوا خنک تھی۔ سڑک سنسان تھی۔ معدے میں چار پیگ تھے۔ اور جیکسن کے مضبوط قدموں کی چاپ تھی، اور جیکسن کے رخسار تمتمائے ہوئے تھے۔ اور وہ شراب کی حدت کو اپنے دل میں اور اپنے رخساروں پر اور اپنی آنکھ کی تپلیوں میں محسوس کر سکتا تھا۔ چلتے چلتے اس کے قدم رک گئے۔ یہاں لڑکیوں کا کالج تھا۔ اور ایک اُستانی سے اس کی آشنائی تھی۔ کرسچین استانی بڑی پرفن تھی۔ اس نے سوچا وہ سپاہیوں کو لے کر کالج کے احاطے میں چلا جائے اور کالج کے ملحق بنگلے میں چلا جائے اور پھر اس اُستانی کو جگا دے۔ پھر وہ مسکرا اُٹھا غلط ہے اسے کم جانا ہے۔ وہ آگے چلنے لگا اور موڑ کو پار کر کے وہ آل انڈیا ریڈیو کی عمارت سے آگے نکل کر اپنی کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے سنتریوں نے اسے سلامی دی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کے عقب میں چلتے ہوئے سپاہی اس کے بنگلے کے دروازے تک

آئے اور سلامی دے کر واپس ہو گئے۔ اس وقت تک جیکسن اندر جا چکا تھا لیکن سلامی سپاہیوں کے لیے پھر بھی ضروری تھی۔

جیکسن اندر پہنچا تو بیرے نے آہستہ سے کہا۔ "وہ آگئے ہیں حضور" کہاں بٹھایا ہے انہیں؟

بیرے نے اشارے سے کہا۔ "مہاشے نہال چند کھوکھری تو سرکار کے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ مولانا اللہ داد پیرزادہ کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔ سرکار پہلے کسے خبر کردوں؟"

جیکسن نے کہا۔ "تم پیرزادہ صاحب کو بیگ ویگ دو، میں مہاشے سے بات کرتا ہوں۔"

مہاشے نہال چند کھوکھری لاہور کے ہندوؤں کے ممتاز لیڈر تھے۔ غریب ہندوؤں کا بھلا چاہتے تھے۔ تین اخباروں، چار کوٹھیوں اور گیارہ ہزار ایکڑ زمین کے مالک تھے۔ ان کا بڑا بیٹا امپیریل بنک کا منیجر تھا، اور چھوٹا کانگرسی ایم ایل اے۔ ان کا داماد ہندو مہاسبھا کا سکریٹری تھا۔ اور وہ خود دیدانتی سوشلسٹ تھے۔ یعنی انھوں نے اپنے خاندان کے لیے مستقبل پر نگاہ رکھتے ہوئے چاروں کھونٹوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ لیکن پریشانی اُن کو یہ تھی کہ ان دنوں ہندو مسلم فساد بڑے زوروں پر تھا اور ان کا کوئی رشتہ دار مسلمان نہ تھا نہ وہ خود کسی مصلحت سے مسلمان ہو سکتے تھے۔ اور انتہی دودا دولچی بات ان کے ذہن میں بھی در آئی تھی، کہ پنجاب یوں آزادی کی بنا پر تقسیم ہوگا۔ اور ان کا خوبصورت شہر لاہور ہندوستان سے نکل کر پاکستان کے حدود میں

رہ جائے گا۔ ورنہ وہ پہلے سے انتظام کرنے اور کچھ نہ ہوتا تو خواجہ حسن نظامی کے ہاتھ پر بیعت کرتے یا اجمیر شریف جا کر نیم مسلمان ہو جاتے۔ اب فساد کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ قتل و غارت گری، بم باری اور قتل و غارت گری کا میدان گرم تھا۔ اور بناہ کی کوئی صورت نہ تھی۔ جیکسن سے ان کی پرانی ملاقات تھی۔ اور وہ اسی سے مشورہ کرنے چلے آئے تھے۔

ویل ہماشے صاحب!

میرا خط آپ کو مل گیا تھا؟ ہنال چند بولے۔

ہاں!

تو آپ بتائیے کیا کیا جائے۔ ہندوؤں کی جانیں سخت خطرے میں ہیں۔ شاہ عالمی دروازہ تو جل چکا ہے۔ سرین کے محلے کے ہندو ختم ہو چکے ہیں۔ کرشن نگر، سنت نگر، آبد نگر، کے ہندو بھی اگر لاہور سے بحفاظت نہ نکالے گئے تو ایک ہفتے کے اندر ختم ہو جائیں گے۔ ڈی اے وی کالج میں راشن دو دن کے لیے باقی رہ گیا ہے۔ وہاں تین ہزار ہندو پناہ گزیں ہیں۔

ہندوستان کی حکومت کیا کر رہی ہے؟ جیکسن نے پوچھا۔

انھوں نے ایک روز ہوائی جہاز سے روٹیاں ڈی۔ اے۔ وی کالج میں پھینکی تھیں۔ روٹیوں کے ساتھ یہ رقعہ بھی تھا کہ ہم لوگ آپ کے نکالنے کا جلد انتظام کر رہے ہیں۔ مگر صاحب ابھی تو حالات بہت بگڑے ہیں۔ سنا ہے پندرہ سو لاریوں کی ضرورت ہے اور ابھی تک صرف ڈھائی سو لاریوں کا بندوبست ہوا ہے۔ ہم لوگ تو انتظار کرتے کرتے مر جائیں گے۔

جیکسن نے مسکرا کر کہا حکومت سو رہی ہے۔ کلکتہ کے ڈپو میں ہزاروں لاریاں

پڑی ہیں خود دلی ہیں، فیروزپور، لدھیانہ کسی ایک شہر کی لاریوں کو [illegible] کرلیا جائے۔ پندرہ سولاریوں کا بندوبست ہوسکتا ہے۔ وہ لوگ کچھ نہیں کریں گے۔

تو پھر ہم کہاں جائیں۔ یہاں بھی تو جہنم ہے۔ پرماتما کے لیے جیکسن صاحب اس وقت ہماری مدد کیجئے۔ اگر ہم سب کی آپ مدد نہ کرسکتے ہوں تو میرے خاندان کو تو یہاں سے نکلوا دیجئے۔ میں ہوں، میری بیوی ہے، دو لڑکے ہیں، ایک داماد ہے، اور ہمارا ریشین کتا ہے۔ ہم لوگ ہوائی جہاز سے چلے جائیں گے یا ملٹری ٹرک سے، باقی لوگوں کو آپ ریل گاڑی سے یا پیدل جتھے یا کسی صورت سے بھیج دیجئے۔ مگر ہمیں پہلے روانہ کردیجئے۔

جیکسن نے یکایک پوچھا۔ "آپ کتنے روپے خرچ کرسکتے ہیں؟"

دس پندرہ بیس پچاس ہزار۔ اس وقت روپے کا کیا سوال ہے۔

جیکسن نے سوچ سوچ کر کہا۔ بڑی مدت کے بعد۔ آپ فی الحال بیس ہزار روپے میرے پاس چھوڑ جائیے میں مسلم خدمت گاروں کے سالار سے جو میرا واقف ہے، بات کرتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے۔ مگر آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں، آپ بھاگتے کیوں ہیں، جم کر مقابلہ کیوں نہیں کرتے حرام زادے مسلموں کا۔

کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ مقابلہ ہاتھوں سے ہوسکتا ہے، صاحب وہاں تو مشین گنیں ہیں ان کے پاس اور رائفل اور چھرے۔

جیکسن نے اپنی کرسی نہال چند کے قریب کھسکا لی۔ اور بولا۔ اگر آپ کو بھی سب سامان مل جائے تو [illegible] اس نے مہاشے جی کو شراب پیش کرتے ہوئے کرسی اور قریب کرلی۔

مہاشے جی کا چہرہ روشن ہوگیا۔ سچ کہہ رہے ہیں آپ؟

جیکسن نے کہا ہم پرانے دوست ہیں ہم آپ کی ضرور مدد کریں گے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ لاہور پر دراصل ہندوؤں کا حق ہے۔ لاہور ہندوؤں نے بنایا ہے، اس کے باغات، اس کے مکانات، اس کے کالج، اس کے سنیما گھر، اس کی ساری رونقیں ہندوؤں کے دم سے ہیں۔ وہی لاہور کے مالک ہیں انہی کو اس میں رہنا چاہیے۔ مردوں کی طرح لڑیے مہاشے جی ہم آپ کی مدد کریں گے۔ آپ کے تصرف میں کتنے آدمی ہیں؟

مہاشے جی نے پیگ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ لاہور کے ہندو صرف ایک لیڈر پر اعتماد رکھتے ہیں اور وہ ہے مہاشے نہال چند کھوکھری۔

زندہ باد! جیکسن نے کہا۔ پھر اس نے گھنٹی بجائی، اور بیرے کے کان میں کچھ کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیرہ واپس آیا اور صاحب کے کان میں کچھ کہہ کر باہر چلا گیا۔

جیکسن نے کہا وہ ابھی آپ یہاں بیٹھیے۔ ایک آدھ گھنٹے میں سب انتظام ہو جاتا ہے، میں نے ٹیلی فون کر دیا ہے، ابھی اسلحہ جات سے بھری ہوئی ایک ملٹری لاری آپ کے ساتھ بھیجتا ہوں اور ایک آدمی بھی جو آپ کے آدمیوں کو تربیت بھی دے سکے گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

مہاشے جی دست بستہ کھڑے ہو گئے، الفیوڑ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ جیکسن صاحب!

جیکسن نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے ابھی ایک اور صاحب سے ملنا ہے۔ آپ یہاں بیٹھیے ایک پیگ اور پیجیئے آج سردی بہت زیادہ ہے نا۔ اور وہاں اسلحہ جات کی قیمت وہ لاری ڈرائیور آپ سے وصول کرے گا۔

شکریہ! مہاشے نہال چند چہکے، مگر ایک بات ہے۔ وہ آپ میرے خاندان کو

امرت سر بھیجنے کا بندوبست تو ضرور کر دیجئے۔ باقی یہاں میں سب بندوبست کر کے ہی جاؤں گا۔

بہت اچھا۔

ڈرائنگ روم میں مولانا اللہ داد پیرزادہ تشریف فرما تھے۔ اور بے جھجک شراب نوشی میں مصروف تھے۔

کیسے مولانا مزے میں ہیں؟

چھوڑیئے ناجکین صاحب یہ باتیں۔ مزے تو پولیس والوں کے ہیں۔ آج کل سُنا ہے لاہور کے ہر پولیس کے سپاہی نے اتنا سونا لوٹ لیا ہے کہ اب سات پشتوں کے لیے کافی ہوگا۔ اس کے لیے۔ اب سنتریوں کا یہ حال ہے تو آپ کا بنگلہ تو سونے کی اینٹوں کا ہونا چاہیے۔

بڑے سور ہو مولانا۔ جکین نے ان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا

جبھی تو سی، آئی، ڈی میں کام کرتا ہوں۔ حضور

تو بولو کیا بات ہے۔

سنئے۔ ماڈل ٹاؤن میں سب سے زیادہ امیر ہندو اور سکھ لوگ رہتے ہیں۔ دو تین بار حملہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر وہاں ڈوگرہ سپاہیوں نے ایک نہ چلنے دی، پھر ان لوگوں کے پاس پستول وغیرہ ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے سرکلر روڈ کے مسلمانوں کا ایک جتھا حملہ کرنے کی نیت سے گیا تھا۔ چالیس آدمی مرے۔ ہمارے پاس ہتھیار کہاں ہیں۔ ہندوؤں کے پاس نہ جانے کہاں سے ملب مشین گنیں۔ رائفل پستول۔ سب کچھ آجاتے ہیں۔ بے چارے غریب

مسلمانوں کو خالی خولی چھروں اور چاقوؤں سے لڑنا پڑ رہا ہے۔

تو میں اسلحہ کہاں سے دلواؤں، تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو اللہ داد۔ اسلحہ جات روپے کے بغیر نہیں مل سکتے۔ میرے پاس ہوتے تو میں ضرور دے دیتا۔ مجھے تو ہندوستان میں نہیں، پاکستان میں رہنا ہے۔ ہندو بنیوں سے مجھے کوئی محبت نہیں ہے۔ اور پھر اسلام کی تعلیم ہمارے عیسائی مذہب سے ملتی جلتی ہے، عیسائی مسلمان کے ساتھ مل سکتا ہے۔ لیکن ہندو کے ساتھ اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔

میں روپیہ لایا ہوں۔ مولانا نے مسکرا کر کہا۔

کہاں ہے؟

ایک مسلمان جاگیردار کو بچانسا ہے۔ دین کے نام پر اور کفر کے خلاف جہاد کرنے کے لیے پچاس ہزار روپیہ لایا ہوں، آپ جلد از جلد اسلحہ جات کا انتظام کر دیجئے۔ ہم لوگ ماڈل ٹاؤن کو لوٹنا چاہتے ہیں۔

جیکسن نے گھنٹی بجائی، بیرا حاضر ہوا، اور جیکسن صاحب نے اس کے کان میں کچھ کہا اور واپس چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد آیا تو اس نے پھر جیکسن صاحب کے کان میں کچھ کہا اور پھر واپس ہو گیا۔

جیکسن نے پچاس ہزار کے نوٹ لے کر کہا۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں، تم ڈرائیور کو دے دینا۔ میں نے اسلحہ جات کی ایک لاری منگائی ہے، ابھی آدھ گھنٹے میں آ جائے گی۔ اسے لے کر چلے جاؤ۔ اور دیکھو آئندہ مجھے پریشان نہ کرنا۔ ہاں سن لو۔ میں نے یہ اسلحہ جات بڑی مشکل سے منگائے ہیں، اور جو دام وہ مانگتے تھے اس سے کہیں کم قیمت پر میں نے کہا۔ غریب مسلمان ہیں۔ اتنے پیسے کہاں دے سکیں گے۔ یہ تمہیں مفت میں پڑے ہیں لے جاؤ

اصفی۔ اور میرا پیچھا چھوڑدو، تم مسلمانوں کے لیے میں نے اتنا کچھ کیا ہے اور تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ مجھے پولیس سپرنٹنڈنٹ ہی بنا دو۔ احسان فراموش کہیں کے۔

پیرزادہ نے دوسرا پیگ پیتے ہوئے کہا۔ بڑی اچھی شراب ہے۔ کہاں سے منگائی ہے۔

پرانی فرانسیسی شراب ہے۔ ایک ہندو راجہ نے بھیجی ہے۔ اس کی رانی کو لاہور بحفاظت پہونچا دیا تھا۔

رانی خوبصورت ہوگی۔ پیرزادہ نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا۔ پرانی فرانسیسی شراب کی طرح۔

"ڈیم سوائن" جیکسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور تم کیا کہوگے۔ سنا ہے کہ آج کل ہر روز ایک نئی کنواری۔

اللہ دیتا ہے۔ پیرزادہ مسکرا کر پیگ اپنی آنکھوں کے سامنے لایا۔ بجلی کی روشنی میں شراب پگھلے ہوئے سونے کی طرح چمکنے لگی۔

جب دونوں لاریاں یکے بعد دیگرے بیس منٹ کا وقفہ رکھ کے دو مختلف سمتوں کو روانہ ہو گئیں۔ تو جیکسن اپنے بوٹ کھولے بغیر ڈرائنگ روم کے دیوان پر دراز ہو گیا۔ اور جروٹ کے گھنے دھوئیں میں اپنے مستقبل کی منظر کشی کرنے لگا۔ اس کی بیوی ادھیڑ عمر کی ہو گئی تھی۔ وہ اسے ولایت نہیں لے جائے گا۔ بلکہ اسے یہیں طلاق دے کر اور ایک معقول رقم دے کر اس سے پیچھا چھڑائے گا۔ کیونکہ اس کی بیوی کارنگ اس کی بیٹیوں کی طرح صبیح تھا۔ بلکہ اس میں ہندیت کی جھلک نمایاں تھی اس لیے

جکسن کبھی اپنی بیوی کو یوروپین لوگوں کی اونچی پارٹیوں میں نہ لے جاتا تھا۔ ہاں اپنی بیٹیوں سے اسے بڑی محبت تھی۔ وہ اپنی بیٹیوں کو ولایت لے جائے گا اور وہاں سو فی صدی خالص انگریزوں سے اس کی شادی کرے گا۔ اب اس کے پاس اتنا روپیہ ہو گیا تھا کہ وہ اس روپے سے اپنی لڑکیوں کے لیے اعلیٰ خاندان کے شریف لیکن غریب انگریزوں کو خرید سکتا تھا۔ وہ خود بھی ایک شادی کرے گا کسی حسین پری جمال انگریزی کوٹمس سے جس کا اپنا حلقہ ہوگا، اور فیر ہال میں اس کے آباؤ اجداد کی تصویریں لٹک رہی ہوں گی۔ اور اس کے ماتھے پر موتیوں کا تاج ہوگا۔ پرانا خاندانی تاریخی تاج اور روزنامہ لندن ٹائمز میں ان کی شادی کی تصویر چھپے گی جکسن نے مسرت کا سانس لیا۔ اور بیرے سے پوچھا۔

چھوٹی میم صاحب لوگ کدھر ہیں۔ برٹ سے آئے کہ نہیں۔

بیرے نے جواب دیا۔ بڑی میم صاحب سنتھیا صاحب آ گئیں۔ چھوٹی میم صاحب روزی صاحب صبح آئیں گی۔ ناچنے کا مقابلہ ہے۔ یہ چٹھی چھوٹی میم صاحب روزی صاحب نے آپ کے واسطے دیا ہے۔

جکسن نے دوسرا پیگ انڈیلا اور چٹھی کھول کر دیوان پر دراز ہو گیا اور اطمینان سے اپنی چہیتی بیٹی کا خط پڑھنے لگا۔

پیارے سے پیارے ڈارلنگ پپا

یہ تمھاری پیاری بیٹی روزی کا خط ہے جو وہ تمھیں برٹ سے لکھ رہی ہے۔

آج یہاں ناچ کا مقابلہ ہے نا۔ لیکن سنتھیا جلد گھر لوٹ رہی ہیں اور میں یہاں ٹھہر رہی ہوں، کیونکہ تمھیں معلوم ہے کہ میں اول نمبر پر آؤں گی اس لیے اس انعام کو بھی کیوں چھوڑوں۔ لیکن اس وقت میں یہ خط تمھیں پیارے پپا

اس مطلب کے لیے نہیں لکھ رہی ہوں۔ گو اس وقت میرے سامنے خوش پوش خوبصورت جوڑے راج ہنسوں کی طرح ناچ گھر کے فرش پر تیرتے ہوئے دائرے میں گزرتے جا رہے ہیں۔ اور حسین فانوسوں کی روشنی ہے اور آرکسٹرا کی نغمہ باریاں ہیں۔ اور حسین طلائی غبار سا فضا میں چھا گیا ہو۔ جیسے سورج اور چاند یک جا ہو گئے ہوں۔ اور ہمارے دلوں میں اُتر آئے ہوں۔ میں نے تھوڑی سی شیری پی لی ہے۔ اس لیے یہ شاعری کر رہی ہوں۔

مگر میں تمھیں یہ خط شیری یا شاعری یا رقص کے لیے نہیں لکھ رہی ہوں۔ یہ خط تمھیں اپنے ساتھی کے متعلق لکھ رہی ہوں۔ جو اس وقت میرے سامنے کرسی پر بیٹھا ہے۔ اور میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ اس کا نام آنند ہے۔ ہاں یہ ہندستانی ہے۔ اور میں پچھلے دو برس سے اسے جانتی ہوں تم چونک پڑے ہو گے پپا۔ اور شاید خفا بھی ہو گے۔ لیکن آنند ایسا لڑکا نہیں ہے جس پر کوئی خفا ہو سکے۔ وہ اتنا اچھا ناچتا ہے کہ برٹ میں کوئی اینگلو انڈین یا انگریز لڑکا بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آنند کا رنگ سانولا ہے، اور تمھیں معلوم ہے کہ مجھے سانولے رنگ سے کتنی نفرت ہے۔ اسی لیے تو جب آنند مجھے پہلی بار برٹ میں ملا اور مجھ سے متعارف ہوا تو میں بڑی درشتی سے اس کے ساتھ پیش آئی۔ لیکن دوسرے ہندستانی لڑکوں کی طرح وہ خفیف نہیں ہوا، اس نے بُرا بھی نہیں مانا بلکہ صرف مسکرا دیا۔ تم جانتے ہو پپا کہ میں ہندستانی لڑکوں سے میل جول پسند نہیں کرتی۔ لیکن آنند کی مسکراہٹ میں کوئی بات ضرور ہے۔ جب وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا تو مجھے ایسا معلوم

ہوا گویا میرے دل کے رنگین محلوں کی دنیا کی بنیادیں ڈولنے لگیں۔ آنند کی مسکراہٹ بڑی خطرناک ہے۔ اس کا قد چھ فٹ ہے۔ اس کی کمر چیتے کی طرح پتلی ہے۔ اس کی آنکھیں گہری سیاہ اور چمکتی ہوئی ہیں۔ اور جب وہ کمر میں ہاتھ ڈال کر رقص کرتا ہے تو رقص گاہ پر جیسے اندھیرا سا چھا جاتا ہے۔ ذہن میں جیسے بنگال کے جنگل نمودار ہوتے ہیں اور ہزاروں پیڑ جھومنے لگتے ہیں۔ اور سبز سبز چکنے پتے نگاہوں میں جھولتے ہیں۔ اور چیتوں، تیندوں، بھیڑیوں اور جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا گھر بنگال کے کسی جنگل میں ہے۔ اور میں ایک شکاری کی بیوی ہوں۔ اور درختوں کی چھال لپیٹ کر ایک بھیل کے ساتھ جنگل میں ناچ رہی ہوں۔ تم سچ مانو پاپا آنند کے ساتھ پہلے ناچ میں میں نے یہ سب کچھ محسوس کیا تھا۔ اس کو ایک سال ہو گیا اور اس سے ایک سال پہلے وہ مجھ سے ملا تھا اور ایک سال تک برابر وہ مجھ سے ملنے مجھ سے بات کرنے کا خواہاں رہا۔ لیکن میں نے ایک اچھی اینگلو انڈین لڑکی کی طرح سے ہمیشہ ہمیشہ ٹھکرا دیا۔ آنند پڑھا لکھا ہے۔ بہت امیر ہے۔ اس کا باپ گجرانوالہ کا رئیس ہے۔ آنند ولایت ہو آیا ہے۔ اس کے پاس ایک پیکارڈ ہے۔ کئی انگریز مجبور ماؤں کی تصویریں ہیں جو اس سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن میرے دل پر ان باتوں کا مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ پورے ایک سال تک میں نے اس سے بات نہ کی اور وہ متواتر برٹ آ تار رہا۔ اور ذلیل قسم کی اینگلو انڈین اور کرسچین چھوکریوں کے ساتھ ناچتا رہا۔ پہلے پہل تو وہ ناچتا بھی اچھا نہ تھا پھر

بیچ میں تین چار ماہ غائب رہا۔ پھر جب آیا تو اتنا اچھا ناچتا تھا کہ ایک روز مجھے بھی اس کے ساتھ ناچنا پڑا۔ اسی پہلے ناچ کے تاثرات ابھی میں نے تمھیں بتائے ہیں۔ ناچ کے بعد ہم ایک میز پر بیٹھ گئے۔ مجھ پر جیسے کسی نے مسمریزم کر دیا تھا۔

آنند نے پوچھا تم مجھ سے ———— ہندستانیوں سے نفرت کرتی ہو۔

میں نے کہا۔ تمھارے جسموں سے بو آتی ہے۔

آنند نے کہا۔ مجھے سونگھ کر دیکھو۔ بو آتی ہے؟

میں نے سونگھ کر کہا۔ ہاں مگر ———— یہ تو ایک عجیب سی اچھی بو ہے۔ مجھے اقرار کرنا پڑا۔

آنند نے کہا۔ اب تم طامیوں اور دوسری انگریز لڑکیوں کے جسم سونگھو۔ سو میں دس ہندی جسم بدبو دار ہوں گے، اور سو میں پچاس انگریز جسم بدبو دار اور بغیر غسل کیے۔ یہ گندگی ایو ڈی کولون سے کیسے چھپتی ہے۔ اور تم لوگ کالے جو ہو؟"

آنند ہنسا اور اس کے سانولے چہرے پر سفید دانت ایسے چمک اٹھے جیسے بجلی کوند گئی ہو۔ اور میں گھبرا سی گئی۔ وہ بولا کیوں۔ میں نے کہا تمھارے دانت بہت اچھے ہیں۔

آنند بولا۔ ہندیوں کے دانت بڑے خوبصورت ہوتے ہیں سانولے چہرے پر بڑے کھلنے س حس کا ایک رنگ نہیں ہوتا ان ر ہوتے ہیں

کئی رنگوں کی ترکیب سے حسن تعمیر ہوتا ہے۔
میں نے کہا ۔ اور مجھے پاپا نے بتایا ہے کہ تم لوگ بڑے دھوکے باز، جعلساز،
اور بددیانت ہوتے ہو۔ اور تنظیم تم میں نام کو نہیں۔
آنند بولا ۔ تمھارے والد پولیس افسر ہیں۔ وہ ہمیں ان ہندستانیوں سے
پرکھتے ہیں جو روز روز تھانے میں لائے جاتے ہیں۔ اگر میں سکاٹ لینڈ
یارڈ کا افسر ہوتا تو میں بھی انگریزوں کے لیے شاید یہی الفاظ استعمال کرتا۔
رہا تنظیم کا سوال۔ تو کیا تم نہیں جانتی ہو کہ اب دو ایک سالوں میں تم لوگ
یہاں سے جانے والے ہو۔ کانگرس اور لیگ کی تنظیم تم نے دیکھی ہے نا۔
مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے غصے سے جل کر کہا۔ پر تم ہندستانی ہوتے
ہو سور کی اولاد۔ اور میں یہ کہہ کر اس کی میز سے اٹھ گئی۔ آنند مسکراتا
رہا۔ جب میں جا رہی تھی تو اس نے کہا۔
سنو، میں پانچ ہزار برس پرانا ہوں۔ بہت داؤ جانتا ہوں۔ ایک
دن تمھیں قابو میں کرکے چھوڑوں گا۔
مجھے اس کا یہ چیلنج پسند آیا۔ مگر شاید دل کے ایک ٹکڑے کو پسند بھی
آیا کیونکہ اس کے بعد غیر ارادی طور پر اس کے ساتھ مساویانہ سلوک
کرنے لگی۔ بظاہر نہیں۔ دل کے اندر اسے اپنے برابر کا سمجھنے لگی۔ نہ جانے
ایسا کیوں ہوا۔ اور جب کبھی ہماری نگاہیں ایک دوسرے سے چار
ہوتیں تو نگاہیں پہلے مجھی کو ہٹانی پڑتیں اور اس کی مسکراہٹ تو پہلے
کہہ چکی ہوں بہت ہی خطرناک ہے۔ دل کاٹتے سا لگتا ہے جسم میں

ہو جاتا ہے اور گلے میں پھندا سا پڑنے لگتا ہے ، پھر تین چار ماہ گزر گئے اور میں اس کے ساتھ کبھی نہیں ناچی ۔ اتنے عرصے کے بعد مقابلے کا دن آیا ۔ چار و ناچار مجھے مرد ساتھیوں میں اسی کا انتخاب کرنا پڑا ۔ کیونکہ اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ اس سے بہتر ناچنے والا ساتھی مجھے مقابلہ کے لیے کہیں نہیں مل سکتا تھا ۔ ہم دونوں نے انعام حاصل کیا ، انعام حاصل کرنے کی خوشی میں ہم دونوں نے اکٹھے شراب پی ۔ ایک ہی جام سے ۔ وہ میرا بوسہ بھی لے سکتا تھا لیکن اس نے ہنس کر ٹال دیا اور مجھے بڑی راحت سی ہوئی ۔ کیونکہ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے چوم رہا ہے ۔ مجھ سے پیار کر رہا ہے ۔ میرے گرد ہزاروں باہیں سی لپٹی جا رہی ہیں ۔ سانولی سانولی طاقت ور باہیں ، اور میں اپنے آپ کو ان کی گرفت سے نہیں چھڑا سکتی ۔ اور میں خوف زدہ ہو کر اس کی میز سے اٹھ جاتی ہوں ۔ اور وہ نہیں سمجھتا کہ میں اس سے کیوں بھاگ رہی ہوں ۔ اور میں نہیں سمجھتی کہ میں اس کے نزدیک کیوں آ رہی ہوں ۔ ہم دونوں کا وطن الگ ہے ، قوم الگ ہے ۔ مذہب الگ ہے ۔ تہذیب الگ ہے ۔ بول چال الگ ہے کھانا پینا ، اٹھنا بیٹھنا ہر چیز الگ ہے ۔ پھر اس قدر شدید قربت کا اذیت ناک احساس مجھے کیوں ہوتا ہے ۔ اکثر راتیں میری یہی سوچتے سوچتے آنکھوں میں کٹ گئی ہیں ۔ میں سب کچھ تمہیں پیارے پیا نہایت تفصیل سے لکھ رہی ہوں ۔ تاکہ تم اپنی پیاری روزی کے فیصلے اور اس کے مستقبل کی تصویر سے آگاہی

گری اگا ہی حاصل کر سکو۔

اب میں نے اس سے چھپ چھپ کر ملنا شروع کردیا مگر برٹ میں لوگ اسے روزی کا انڈین پارٹنر کہنے لگے تھے۔ اور ممّتھیا اس امر کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ اور اگر میں آرسنڈ کے ساتھ ملاطفت سے پیش آتی تو بیچاری بدنامی بھی ہوتی۔ اور لوگ کہتے کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر جیکسن کی لڑکی ایک کالے ہندستانی سے عشق لڑا رہی ہے۔ یہ میں کیسے برداشت کر لیتی۔ اس لیے میں اس سے چھپ چھپ کے ملتی۔ ہم لوگ اکثر میٹر میں ناچنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ وہاں سب ہندستانی لوگ ہوتے ہیں اور آرکسٹرا تو بہت ہی اچھا ہے۔ یہاں مجھے پہلی بار بہت سے ہندستانی لڑکوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ آرٹسٹ، ادیب، سیاست داں، سوشلسٹ کمیونسٹ، اکالی، کھدر پوش، یہ لوگ جو ہندی فلموں کی باتیں کرتے تھے، ہندی کتابوں کی، ہندی مزدوروں، کسانوں کی۔ ملک اور قوم کو آگے لے جانے کی باتیں۔ سنجیدہ باتیں۔ خوفناک باتیں انگریزی راج کو الٹ دینے کی باتیں۔ ساری دنیا میں ایک برادرانہ نظام، ایک نئی انسانیت کو جنم دینے کی باتیں۔ ایسی باتیں جو میں نے برٹ انسٹیٹیوٹ میں کبھی نہ سنی تھیں۔ ایسی باتیں جو میں نے گھر یا اسکول میں کہیں بھی نہ سنی تھیں۔ ایسی باتیں جن سے مل کر اس دنیا کا سکھ دکھ رنج اور خوشی بنتی ہے۔ ایسی باتیں جنھیں سن کر کچھ کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پیا اب مجھے معلوم ہوا کہ تم اور تمھاری دنیا کتنی فرسودہ

ہے۔ مجھے اس دنیا سے پیار ہے، تم سے، رما سے، سنتھیا سے، مگر اب تم مصری ممیوں کی طرح پرانے ہو چکے ہو، پیارے مگر پرانے، ان رومن نبوں کی طرح جو عجائب گھروں میں رکھے ہوئے ہیں۔

ان دو سالوں کے عرصے میں میں نے کیا کیا ہے۔ میں یہ سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔ کیونکہ یہ سب کچھ میں نے تم سے، رما سے، اور سنتھیا سے چھپ کے، ساری دنیا کی نظروں سے چھپا کر کیا ہے۔ میں نے ان دو سالوں میں ہندستان سے محبت کرنا سیکھا ہے۔ میں نے اس کی بولی سیکھی ہے۔ میں نے اس کے کپڑے پہنے ہیں۔ میں نے اس کے کھانے کھائے ہیں۔ میں نے اس کے گیتوں کو گایا ہے۔ اس کے ناچ گانوں میں حصہ لیا ہے۔ میرے بدن پر ساڑھی اس قدر اچھی لگتی ہے کہ کیا کہوں جی چاہتا ہے کہ دن بھر اسے اپنے جسم سے لپٹائے رکھوں۔ مجھے کتھا کلی اور بھارت ناٹیم کے رقص کی ابدی غنائیت سے عشق ہو گیا ہے، دو سو سال سے میرے ضمیر پر جو زنگ چڑھ چکا ہے اب وہ اتر گیا ہے، پپا میں ہندستانی لڑکی ہوں۔ میری رگوں میں ہندستان کا خون ہے۔ تم بھی ہندستانی ہو پپا۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہمارے چہرے بالکل انگریزوں سے نہیں ہیں۔ ان میں پانچ ہزار سال پرانے نقوش ابھرتے نظر آتے ہیں۔ تم میں، سنتھیا میں، رما میں۔ ہم لوگ ہندستانی ہیں غور سے دیکھو۔

میں نے ان دو سالوں میں ہندستان کو غور سے دیکھا ہے۔ یہ لوگ اتنے ہی برے بھلے ہیں جتنے ہم لوگ، پپا اور مجھے اب جلیبیاں اور امرتیاں اور

موتی چور کے لڈو بہت پسند ہیں اور کھویا اور دال موٹ اور شلوار قمیص بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہے ۔ اور مغلئی کھانے تو اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ ہم لوگوں کے کھانے تو بالکل جنگلی سے معلوم ہوتے ہیں ۔ قورمہ اور روغن جوش اور شامی کباب اور مرغ مسلم اور زردہ پلاؤ ، پیا سچ کہتی ہوں ، تم نے ہمیں سولہ سال تک بد ذائقہ سوپ پلا پلا کر مار ڈالا ۔ اب بھی گھر میں بیٹھی ہوں ، مگر آئندہ سے کبھی نہیں پیوں گی ۔ اور تم نے میگھ دوت کا ترجمہ نہیں پڑھا ہے ورنہ ہندیوں کو کبھی وحشی نہ کہتے ، اس روز بادل گھر کر آئے تھے اور ہمارے سروں پر لوکاٹ کے پیلے پیلے گچھے لٹک رہے تھے ۔ اور ایسی جاں بخش خنک دھوپ تھی ، جب آنند نے ہمیں میگھ دوت کے شعر سنائے شیکسپیر کی عظمت اور گوئٹے کا فلسفہ اور شیلی کا عشق یہ سب کچھ میگھ دوت میں ہے ۔ جو قوم ایسی شاعری کر سکتی ہے اسے غیر متمدن کہنا اپنی حماقت کا ثبوت دینا ہے پیا تم نے سولہ سال تک مجھ سے دھوکا کیا ، تم نے زندگی بھر اپنے آپ کو دھوکے میں رکھا ۔ تم نے اپنے خون سے اپنے ہندی پن کو الگ کرنا چاہا ۔ تم نے اپنی قوم پر حکومت کی جب کہ تمھیں اس کی خدمت کرنی چاہیے تھی ، تم نے ہندو اور مسلمانوں کو لڑوایا ۔ اور آج بھی اسلحہ جات دے کر انھیں لڑوا رہے ہو ۔ جب کہ تمھیں ان کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہیے تھا ۔ آج میری آنکھیں کھلی ہیں اور میں نے اس زندگی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے ۔

میں آنند کے ساتھ جا رہی ہوں ، آنند کے پاس اب کچھ نہیں ہے ، اس کا گھر بار لٹ چکا ہے ، اس کی بیکاری جلا ڈالی گئی ہے ۔ اس کے ماں باپ قتل

سکیے جا چکے ہیں۔ اس کے پاس ایک قمیص ہے اور ایک پتلون۔ لیکن اس کا دل اپنا ہے، اس کی روح اپنی ہے۔ اس کی تہذیب اس کے پاس ہے اور وہ جذبۂ انتقام سے مغلوب نہیں ہے۔ ہم دونوں نے ایک نئی انسانیت کا پیغام سُنا ہے۔ اس جنت ارضی کا تصوّر کیا ہے جہاں ہندو اور مسلمان انگریز اور یہودی، روسی اور افریقی مسرت کے ایک ہی ڈیرے میں آ جاتے ہیں۔ پیا تمھاری کھلنڈری لڑکی ایک کاٹن کی ساری پہن کر مہاجرین کے کیمپ میں جا رہی ہے۔ ہم لوگ ہندوؤں کے پاس جائیں گے مسلمانوں کے پاس جائیں گے۔ اور شاید کوئی ہماری بات نہیں سنے گا۔ اور شاید اسی طرح ہماری موت بھی ہو جائے گی، اور شاید یہ بڑی حماقت ہوگی۔ بڑی بھاری غلطی ہوگی، اینگلو انڈین سماج سے غداری ہوگی۔ مگر کوئی مجھ سے نہ جانے کون بار بار یہی کہتا ہے تو کر تو یہی کر۔ تو اسی طرح اپنے باپ کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے گی۔ تو ہی طرح دو سو سال کی ندامت کے داغ دھوئے گی۔ تو اسی طرح اپنے درج کا سچا حسن حاصل کرے گی۔ تو ہندوستانی عورت ہے۔ تیرا مقام خدمت ہے تاریخ گھر نہیں۔

روزی

جیکسن لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اُٹھا۔ اس کا نشہ غائب ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے دو پیگ انڈیلے اور یکے بادیگرے جلدی جلدی پی گیا۔ وہ چلتا چلتا قدِ آدم شیشے کے سامنے پہونچ گیا۔ وہ اپنی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ میں جیکسن ہوں۔ روزی

میری بیٹی ہے۔ یہ روزی کا خط ہے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑ گئے تھے۔ یکایک اسے معلوم ہوا کہ اس کے چہرے پر ہندی خط وخال نمایاں ہو رہے ہیں، یہ ناک انگریز کی نہیں ہے یہ ہونٹ انگریز کے نہیں ہیں۔ یہ ماتھا یہ کان، یہ آنکھیں، یہ ٹھوڑی۔ یہ تو انگریز کے نہیں ہیں۔ میں ہندستانی ہوں، میں ہندستانی ہوں۔ نہیں۔ نہیں۔ میں انگریز ہوں۔ میں انگریز ہوں۔ میرا گھر یارک شائر میں ہے۔ میری بیوی ایک انگریز کونٹیس ہے۔ اس کے سر پر رومن تاج ہے۔ اور وہ فیرہال میں میرا انتظار کر رہی ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑ لیا۔ کیونکہ اب پھر وہی ہندستانی خد وخال ابھر رہے تھے۔ وہی ہندستانی ماتھا، وہی کالے بال۔ وہی ٹھوڑی، وہی ہونٹ، وہی کان، وہی لب، وہی ہندی آنکھیں بھوؤں کی تراش تک تو ہندستانی ہے۔

جیکسن چیخا۔ نہیں نہیں۔ میں ہندستانی نہیں ہوں۔ میں انگریز ہوں۔ میں ہندستانی نہیں ہوں، میں انگریز ہوں۔ خالص انگریز۔ یارک شائر۔ ڈربی۔ کونٹیس۔ نارمن جمہوریہ۔ نانٹ شاہ آرتھر...........

شیشے کے چاروں طرف ہندستانی قہقہے لگا رہے تھے۔ ہندستانی ہی ہندستانی چاروں طرف ہندستانی چہرے قہقہے لگاتے ہوئے، قریب آتے ہوئے۔ اور قریب آتے ہوئے...

جیکسن نے پستول اٹھا کر فائر کر دیا۔

دوسرے لمحے وہ فرش پر گر گیا، اس کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔

امرتسر

آزادی سے پہلے

جلیان والا باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ اس مجمع میں ہندو تھے، سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ہندو مسلمانوں سے اور مسلمان سکھوں سے الگ صاف پہچانے جاتے تھے۔ صورتیں الگ تھیں، مزاج الگ تھے، تہذیبیں الگ تھیں۔ مذہب الگ تھے لیکن آج یہ سب لوگ جلیان والا باغ میں ایک ہی دل لے کے آئے تھے۔ اس دل میں ایک ہی جذبہ تھا اور اس جذبے کی تیز اور تند آنچ نے مختلف تمدن اور سماج ایک کر دیے تھے۔ دلوں میں انقلاب کی ایک ایسی پیہم روشنی کہ جس نے آس پاس کے ماحول کو بھی برفا دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس شہر کے بازاروں کا ہر پتھر اور اس کے مکانوں کی ہر ایک اینٹ اس خاموش جذبے کی گونج سے آشنا ہے۔ اور اس لرزتی ہوئی دھڑکن سے نغمہ ریز ہے جو ہر لمحے کے ساتھ گویا کہتی جاتی ہے۔ آزادی۔ آزادی۔

آزادی... ... ...

جلیان والا باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ اور سبھی نہتے تھے اور سبھی آزادی کے پرستار تھے۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں نہ دلوں میں نفرت گن نہ اسٹین گن۔ ہینڈ گرنیڈ نہ تھے۔ دیسی یا ولائتی ساخت کے بم بھی نہ تھے بلکہ پاس کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی نگاہوں کی گرمی کسی بھونچال کے قیامت خیز لاوے کی حدت کا پتہ دیتی تھی سامراجی فوجوں کے پاس لوہے کے ہتھیار تھے۔ یہاں دل فولاد کے بن کے رہ گئے تھے اور روحوں میں ایسی پاکیزگی سا گئی تھی جو صرف اعلیٰ و ارفع قربانی سے حاصل ہوتی ہے پنجاب کے پانچوں دریاؤں کا پانی اور ان کے رومان، اور ان کا سچا عشق اور ان کی تاریخی بہادری آج ہر فرد بشر بچے بوڑھے کے ٹمٹماتے ہوئے رخساروں میں تھی، ایک ایسا اجلا اجلا غرور جو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب قوم جوان ہو جاتی ہے۔ اور سویا ہوا ملک بیدار ہو جاتا ہے جنھوں نے امرتسر کے یہ تیور دیکھے ہیں۔ وہ ان گردوں کے اس مقدس شہر کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔

جلیان والا باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا، اور گولی بھی ہزاروں پر چلی تینوں طرف راستہ بند تھا اور چوتھی طرف ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ جو زندگی سے موت کو جاتا تھا ہزاروں نے خوشی خوشی جام شہادت پیا، آزادی کی خاطر ہندو مسلمانوں، اور سکھوں نے مل کر اپنے سینوں کے خزانے لٹا دیئے۔ اور پانچوں دریاؤں کی سرزمین میں ایک چھٹے دریا کا اضافہ کیا تھا یہ ان کے ملے جلے خون کا دریا تھا یہ ان کے لہو کی طوفانی ندی تھی جو اپنی امنڈتی ہوئی لہروں کو لیے ہوئے اٹھی اور سامراجی قوتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گئی، پنجاب نے سارے ملک کے لیے

اپنے خون کی قربانی دی تھی۔ اور اس وسیع آسمان تلے کس نے آج تک مختلف تہذیبوں، مختلف مذہبوں اور مختلف مزاجوں کو ایک ہی جذبے کی خاطر یوں ضم ہوتے نہ دیکھا تھا۔ جذبۂ شہیدوں کے خون سے استوار ہو گیا تھا۔ اس میں رنگ آ گیا تھا حسن، رعنائی اور تخلیق کی چمک سے جگمگا اٹھا ... آزادی ... آزادی ... آزادی!

۲

صدیق کٹرہ فتح خاں میں رہتا تھا۔ کٹرہ فتح خاں میں اوم پرکاش بھی رہتا تھا جو امرتسر کے ایک مشہور بیوپاری کا بیٹا تھا۔ صدیق اسے اور اوم پرکاش صدیق کو بچپن سے جانتا تھا۔ وہ دونوں دوست نہ تھے کیونکہ صدیق کا باپ کچی چڑھ بیچتا تھا اور غریب تھا اور اوم پرکاش کا باپ بینکر تھا اور امیر تھا۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ دونوں ہمسائے تھے اور آج جلیان والا باغ میں دونوں اکٹھے ہو کر ایک ہی جگہ پر اپنے رہنماؤں کے خیالات اور ان کے تاثرات کو اپنے دل میں جگہ دے رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتے اور یوں مسکرا اٹھتے جیسے وہ سدا سے بچپن کے ساتھی ہیں اور ایک دوسرے کا بھید جانتے ہیں۔ دل کی بات نگاہوں میں نتھر آئی تھی ... آزادی ... آزادی ... آزادی۔

اور جب گولی چلی تو پہلے اوم پرکاش کو لگی کندھے کے پاس اور وہ زمین پر گر گیا۔ صدیق اسے دیکھنے کے لیے جھکا تو گولی اس کی ٹانگ کو چھیدتی ہوئی پار ہو گئی۔ پھر دوسری گولی آئی۔ پھر تیسری۔ پھر جیسے بارش ہوتی ہے۔ بس اسی طرح گولیاں برسنے لگیں اور خون بہنے لگا۔ اور سکھوں کا خون مسلمانوں میں اور

مسلمانوں کا خون ہندوؤں میں مدغم ہوتا گیا۔ ایک ہی گرمی تھی، ایک ہی قوت تھی، ایک ہی نگاہ تھی جو سب دلوں کو چھیدتی چلی جارہی تھی۔ صدیق اوم پرکاش پر اور بھی جھک گیا۔

اس نے اپنے جسم کو اوم پرکاش کے لیے ڈھال بنالیا۔ اور پھر وہ اوم پرکاش دونوں گولیوں کی بارش میں گھٹنوں کے بل گھسٹتے گھسٹتے اس دیوار کے پاس ہو بچے تو اتنی اونچی دکھتی کہ اسے کوئی پھلانگ نہ سکتا لیکن اتنی اونچی ضرور تھی کہ اسے پھلانگتے ہوئے کسی سپاہی کی گولی کا خطرناک نشانہ بننا زیادہ مشکل نہ تھا۔

صدیق نے اپنے آپ کو دیوار کے ساتھ لگادیا اور جانور کی طرح چاروں پنجے زمین پر ٹیک کر کہا۔ لو پرکاش جی خدا کا نام لے کے دیوار پھلانگ جاؤ۔

گولیاں برس رہی تھیں۔

پرکاش نے بڑی مشکل سے صدیق کی پیٹھ کا سہارا لیا اور پھر اونچا ہو کر اس نے دیوار کو پھلانگنے کی کوشش کی۔

ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی۔

جلدی کرو صدیق نے نیچے سے کہا۔

لیکن اس سے پہلے پرکاش نیچے جاچکا تھا۔ صدیق نے اسی طرح اکڑوں رہ کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر یک لخت سیدھے ہو کر جو ایک جست لگائی تو دیوار کے دوسری طرف لیکن دوسری طرف جاتے جاتے سنسناتی ہوئی گولی اس کی دوسری ٹانگ کے پار ہوگئی۔

صدیق پرکاش کے اوپر جا گرا۔ پھر جلدی سے الگ ہو کر اسے اٹھانے لگا۔

تمھیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی پرکاش۔

لیکن پرکاش مرا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی ابھی زندہ تھی۔ اس کی جیب میں دو ہزار کے نوٹ کلبلا رہے تھے۔ اس کا گرم خون ابھی تک زمین کو سیراب کیے جا رہا تھا۔ حرکت تھی، زندگی تھی، اضطراب تھا، لیکن وہ خود مرچکا تھا۔ صدیق نے اسے اٹھایا اور اسے گھر لے چلا، اس کی دونوں ٹانگوں میں درد شدت کا تھا۔ لہو بہ رہا تھا۔ ہیرے کی انگوٹھی نے بہت کچھ کہا سنا۔ لوگوں نے بہت کچھ سمجھایا۔ وہ تہذیب جو مختلف تھی۔ وہ مذہب جو الگ تھا۔ وہ سوچ جو بیگانہ تھا۔ اس نے طنز و تشنیع سے بھی کام لیا۔ لیکن صدیق نے کسی کی نہ سُنی۔ اور اپنے بہتے ہوئے لہو اور اپنی نکلتی ہوئی زندگی کی فریاد بھی نہ سنی۔ اور اپنے راستے پر چلتا گیا۔ یہ راستہ بالکل نیا تھا۔ گو کرہ قتح خاں ہی کو جاتا تھا۔ آج فرشتے اس کے ہمراہ تھے گو وہ ایک کافر کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے تھا۔ آج اس کی روح اس قدر امیر تھی کہ کرہ فتح خاں پہونچ کر اس نے سب کا بر لو ہیرے کی انگوٹھی اور یہ لو دو ہزار روپے کے نوٹ۔ اور یہ ہے شہید کی لاش اتنا کہہ کر صدیق بھی وہیں گر گیا۔ اور شہر والوں نے دونوں کا جنازہ اس دھوم سے اٹھایا گویا وہ سگے بھائی تھے۔

۳

ابھی کرفیو نہ ہوا تھا۔ کہ چرام داس کی دو مسلمان عورتیں، ایک سکھ عورت، اور ایک ہندو عورت سبزی خریدنے آئیں۔ وہ مقدس گوردوارے کے سامنے سے گزریں ہر ایک نے تعظیم دی اور پھر منہ پھیر کر سبزی خریدنے میں مصروف ہو گئیں۔ انھیں بہت جلد لوٹنا تھا۔ کرفیو ہونے والا تھا اور فضا میں شہیدوں کے خون کی گونج باقی تھی پھر بھی باتیں کرتے اور سودا خریدتے انھیں دیر ہو گئی اور جب واپس چلنے لگیں تو کرفیو

میں چند منٹ ہی باقی تھے۔

بیگم نے کہا۔ آؤ۔ اس گلی سے نکل چلیں۔ وقت سے پہونچ جائیں گے۔

پارو نے کہا پر وہاں تو پہرہ ہے گوروں کا۔

شام کور بولی۔ اور گوروں کا کوئی بھروسہ نہیں۔

زینب نے کہا۔ وہ عورتوں کو کچھ نہ کہیں گے ہم گھونگھٹ کاڑھے نکل جائیں گی۔ جلدی سے چلو۔

وہ پانچوں دوسری گلی سے ہو لیں۔ فوجیوں نے کہا اس جھنڈے کو سلام کرو۔ یہ یونین جیک ہے۔

عورتوں نے گھبرا کر اور بوکھلا کر سلام کیا۔

اب یہاں سے وہاں تک۔ فوجی نے گلی کی لمبائی بتاتے ہوئے کہا گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی یہاں سے فی الفور نکل جاؤ۔

گھٹنوں کے بل۔ یہ تو ہم سے نہ ہو گا۔ زینب نے جھک کر کہا۔

ادھ جھک کر چلو... سرکار کا حکم ہے۔ گھٹنوں کے بل گھسٹ کر چلو۔

ہم تو یوں جائیں گے۔ شام کور نے تن کر کہا۔ دیکھیں کون روکتا ہے۔ ہمیں یہ کہہ کر وہ چلی۔

ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ پارو نے ڈر کر کہا۔

ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ گورے نے کہا۔ ہم گولی مارے گا۔

شام کور سیدھی جا رہی تھی۔

ٹھائیں۔

شام کور گر گئی۔

زینب اور بیگم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر وہ دونوں گھٹنوں کے بل گر گئیں۔ گورا خوش ہو گیا۔ اس نے سمجھا کہ سرکار کا حکم بجا لا رہی ہیں۔

زینب اور بیگم نے گھٹنوں کے بل گر کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے، اور چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ دونوں سیدھی کھڑی ہو گئیں اور گلی کو پار کرنے لگیں۔

گورا بھونچکا رہ گیا۔ پھر غصے سے اس کے گال تمتما اٹھے اور اس نے رائفل سیدھی کی۔

ٹھائیں ٹھائیں۔

پارو رونے لگی۔ اب مجھے بھی مرنا ہوگا۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ میرے پتا دیو۔ میرے بھو۔ میری ماں جی۔ میرے پتا۔ میرے ویرو۔ مجھے شما کرنا۔ آج مجھے بھی مرنا ہوگا۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ پھر مجھے بھی مرنا ہوگا۔ میں اپنی بہنوں کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔

پارو روتے روتے آگے بڑھی۔

گورے نے نرمی سے اسے سمجھایا۔ "رونے کی ضرورت نہیں۔ سرکار کا حکم مانو اور اس گلی میں یوں گھٹنوں کے بل گر کر چلتی جاؤ۔ پھر تمھیں کوئی کچھ نہ کہے گا۔"

گورے نے خود گھٹنے پر گر کر اسے چلنے کا انداز سمجھایا۔

پارو روتے روتے گورے کے قریب آئی۔ گورا اب سیدھا تن کر کھڑا تھا۔ پارو نے زور سے اس کے منہ پر تھوک دیا اور پھر پلٹ کر گلی کو پار کرنے لگی۔ وہ گلی کے بیچوں بیچ سیدھی تن کر چلی جا رہی تھی اور گورا اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا چند لمحوں کے بعد اس نے اپنی بندوق سیدھی کی۔ اور پارو جو اپنی سہیلیوں میں سب سے

زیادہ کمزور اور بزدل تھی سب سے آگے جا کر مر گئی ۔

پارو ۔ زینب ۔ بیگم ۔ شام کور ۔

گھر کی عورتیں ۔ پردے دار خواتین ۔ عفت مآب بی بیاں ۔ اپنے سینوں میں اپنے خاوند کا پیار اور اپنے بچوں کی ممتا کا دودھ لیے ظلم کی اندھیری گلی سے گزر گئیں ۔ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو گئے ، لیکن ان کے قدم نہیں ڈگمگائے ۔ اس وقت کسی کی محبت نے پکارا ہوگا ۔ کسی کے ننھے بازوؤں کا بلاوا آیا ہوگا ۔ کسی کی سہانی مسکراہٹ دکھائی دی ہوگی لیکن ان کی روحوں نے کہا نہیں ، آج تمہیں جھکنا نہیں ہے ۔ آج صدیوں کے بعد وہ لمحہ آیا ہے جب سارا ہندوستان جاگ اٹھا ہے اور سیدھا تن کر اس گلی سے گزر رہا ہے ، سر اٹھائے آگے بڑھ رہا ہے ۔ سر اٹھائے آگے بڑھ رہا ہے ۔ زینب ... بیگم ... پارو ... شام کور ... کس نے کہا اس ملک سے ستیا مر گئی ؟ کس نے کہا اب اس دیس میں ستی ساوتری پیدا نہیں ہوتی ؟ ... آج اس گلی کا ہر ذرہ کسی کے قدوسی لہو سے روشن ہے ۔ شام کور ، زینب ، پارو ، بیگم ، آج تم خود اس گلی سے سر اونچا کر کے نہیں گزری ہو ، آج تمہارا دیس فخر سے سر اٹھائے اس گلی سے گزر رہا ہے ۔ آج آزادی کا اونچا جھنڈا اس گلی سے گزر رہا ہے ۔ آج تمہارے دیس تمہاری تہذیب ، تمہارے مذہب کی قابل احترام روایتیں زندہ ہو گئیں ، آج انسانیت کا سر غرور سے بلند ہے ۔ تمہاری روحوں پر ہزاروں ، لاکھوں سلام .....

امرتسر

آزادی کے بعد

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان آزاد ہوا۔ پاکستان آزاد ہوا۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ عیسوی کو ہندستان بھر میں جشن آزادی منایا جا رہا تھا۔ اور کراچی میں آزاد پاکستان کے فرحت ناک نعرے بلند ہو رہے تھے۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور جل رہا تھا۔ اور امرتسر میں ہندو مسلم سکھ عوام فرقہ وارانہ فساد کی ہولناک لپیٹ میں آ چکے تھے۔ کیونکہ کسی نے پنجاب کے عوام سے نہیں پوچھا تھا کہ تم الگ رہنا چاہتے ہو یا مل جل کے جیسا تم صدیوں سے رہتے چلے آئے ہو۔ صدیوں پہلے مطلق العنانی کا دور دورہ تھا۔ اور کسی نے عوام سے کبھی نہ پوچھا تھا۔ پھر انگریزوں نے اپنے سامراج کی بنیاد ڈالی۔ اور انھوں نے پنجاب سے سپاہی اور گھوڑے اپنی فوج میں بھرتی کیے اور اس کے عوض پنجاب کو نہریں، پنشنیں عطا فرمائیں۔ لیکن انھوں نے بھی

پنجابی عوام سے یہ سب کچھ پوچھ کے تھوڑی کیا تھا۔ اس کے بعد سیاسی شعور آیا، اور سیاسی شعور کے ساتھ جمہوریت آئی، اور جمہوریت کے ساتھ جمہوری سیاست داں آئے اور سیاسی جماعتیں آئیں۔ لیکن فیصلہ کرتے وقت انھوں نے پنجابی عوام سے کچھ نہ پوچھا۔ ایک نقشہ سامنے رکھ کر پنجاب کی سرزمین کے نوک قلم سے دو ٹکڑے کر دیے۔ فیصلہ کرنے والے سیاست داں گجراتی تھے، کشمیری تھے، اس لیے پنجاب کے نقشے کو سامنے رکھ کے اس پر قلم سے ایک لکیر۔ ایک حد فاصل قائم کر دینا ان کے لیے زیادہ مشکل نہ تھا۔ نقشہ ایک نہایت ہی معمولی سی چیز ہے۔ آٹھ آنے روپے میں پنجاب کا نقشہ ملتا ہے۔ اس پر لکیر کھینچ دینا بھی آسان ہے۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا۔ ایک روشنائی کی لکیر۔ وہ کیسے پنجاب کے دکھ کو سمجھ سکتے تھے۔ اس لکیر کی ماہیت کو جو اس نقشے کو نہیں پنجاب کے دل کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ پنجاب کے تین مذہب تھے لیکن اس کا دل ایک تھا۔ لباس ایک تھا۔ اس کی زبان ایک تھی، اس کے گیت ایک تھے۔ اس کے کھیت ایک تھے، اس کے کھیتوں کی رومانی فضا اور اس کے کسانوں کے پنچائتی ولولے ایک تھے۔ پنجاب میں وہ سب باتیں موجود تھیں جو ایک تہذیب، ایک دیس، ایک قومیت کے وجود کا احاطہ کرتی ہیں، پھر کس لیے اس کے گلے پر چھری چلائی گئی؟ "ہمیں معلوم نہ تھا" "ہمیں بڑا افسوس ہے" "ہم اس ظلم کی مذمت کرتے ہیں"۔ ظلم اور نفرت اور مذہبی جنون کو بھڑکانے والے، پنجاب کی وحدت کو مٹا دینے والے آج مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہیں۔ اور آج پنجاب کے بیٹے دلی کی گلیوں میں اور کراچی کے بازاروں میں بھیک مانگ رہے ہیں۔ اور ان کی عورتوں کی عصمت لُٹ چکی ہے۔ اور ان کے کھیت ویران پڑے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہندستان اور پاکستان کی حکومتوں

نے آج تک پنجابی پناہ گزینوں کے لیے بیس کروڑ روپے صرف کیے ہیں یعنی فی کس بیس روپے بڑا احسان کیا ہے۔ ہماری سات پشتوں پر۔ ارے ہم تو مہینے میں بیس روپے کی لسی پی جاتے ہیں اور آج تم ان لوگوں کو خیرات دینے چلے ہو جو کل تک ہندستان کے کسانوں میں سب سے زیادہ خوش حال تھے۔ جمہوریت کے پرستارو ذرا پنجاب کے کسانوں سے، اس کے طالب علموں سے، اس کے کھیت مزدوروں سے، اس کے دکان داروں سے، اس کی ماؤں، بیٹیوں اور بہوؤں ہی سے پوچھ تو لیا ہوتا کہ اس نقشے پر جو کالی لکیر لگ رہی ہے اس کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟ مگر وہاں فکر کس کو ہوتی کسی کا اپنا دیس ہوتا، کسی کا اپنا وطن ہوتا، کسی کی اپنی زبان ہوتی، کسی کے اپنے گیت ہوتے تو وہ سمجھ سکتا کہ یہ غلطی کیا ہے اور اس کا خمیازہ کسے بھگتنا پڑے گا۔ یہ دکھ وہی سمجھ سکتا ہے جو ہیر کو رانجھے سے جدا ہوتے ہوئے دیکھے۔ جو سوہنی کو مہینوال کے فراق میں تڑپتا دیکھے جس نے پنجاب کے کھیتوں میں اپنے ہاتھوں سے گیہوں کی سبز بالیاں اُگائی ہوں اور اس کے کپاس کے پھولوں کے ننھے چاندوں کو چمکتا ہوا دیکھا ہو، یہ سیاست داں کیا سمجھ سکتے اس دُکھ کو۔ جمہوریت کے سیاست داں تھے نا۔

خیر یہ رونا مرتا ہوتا رہتا ہے۔ انسان کو انسان ہونے میں بہت دیر ہے۔ اور پھر ایک ہیچمداں افسانہ نگار کو ان باتوں سے کیا اسے زندگی سے۔ سیاست سے۔ علم و فن سے۔ سائنس سے۔ تاریخ و فلسفے سے کیا لگاؤ۔ اسے کیا غرض کہ پنجاب مرتا ہے یا جیتا ہے، مزدوروں کی عصمتیں برباد ہوتی ہیں یا محفوظ رہتی ہیں۔ بچوں کے گلے پر چھری پھیری جاتی ہے یا ان پر مہربان ہونٹوں کے بوسے ثبت ہوتے ہیں۔ اسے ان باتوں سے الگ ہو کر کہانی سنانا چاہیے۔ اپنی چھوٹی موٹی کہانی جو لوگوں کے دلوں کو خوش کر سکے۔ یہ بڑے بول اسے

زیب نہیں دیتے۔

ٹھیک تو کہتے ہیں آپ، اس لیے اب امرتسر کی آزادی کی کہانی سُنیئے۔ اس شہر کی کہانی جہاں جلیان والا باغ ہے۔ جہاں شمالی ہند کی سب سے بڑی تجارتی منڈی ہے جہاں سکھوں کا سب سے بڑا مقدس گردوارہ ہے۔ جہاں کی قومی تحریکوں میں مسلمانوں، ہندوؤں، اور سکھوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ کہا جاتا ہے کہ لاہور اگر فرقہ داری کا قلعہ ہے تو امرتسر قومیت کا مرکز ہے۔ اسی قومیت کے سب سے بڑے مرکز کی داستان سنیئے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ عیسوی کو امرتسر آزاد ہوا۔ پڑوس میں لاہور جل رہا تھا، مگر امرتسر آزاد تھا۔ اور اس کے مکانوں، دکانوں بازاروں پر ترنگے جھنڈے لہرا رہے تھے، امرتسر کے قوم پرست مسلمان اس جشن آزادی میں سب سے آگے تھے کیونکہ وہ آزادی کی تحریک میں سب سے آگے رہے تھے۔ یہ امرتسر اکالی تحریک ہی کا امرت سر نہ تھا یہ احراری تحریک کا بھی امرتسر تھا۔ یہ ڈاکٹر ستیہ پال کا امرتسر نہ تھا یہ کچلو اور حسام الدین کا امرتسر تھا، اور آج امرت سر آزاد تھا۔ اور اس کی قوم پرور فضا میں آزاد ہندوستان کے نعرے گونج رہے تھے، اور امرتسر کے مسلمان اور ہندو اور سکھ یک جا خوش تھے۔ جلیان والا باغ کے شہید زندہ ہوگئے تھے۔

شام کو جب اسٹیشن پر چراغاں ہوا تو آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان سے دو اسپیشل گاڑیاں آئیں۔ پاکستان سے آنے والی گاڑی میں ہندو اور سکھ تھے۔ ہندوستان سے آنے والی گاڑی میں مسلمان تھے۔ تین چار ہزار افراد اس گاڑی میں اور اتنے ہی دوسری گاڑی میں۔ کل چھ سات ہزار افراد۔ بمشکل دو ہزار زندہ ہوں گے باقی لوگ مرے پڑے تھے اور ان کی لاشیں سر بریدہ تھیں اور ان کے سر نیزوں پر لگا کے گاڑیوں کی کھڑکیوں میں سجائے

گئے تھے، پاکستان اسپیشل پر اُردو کے موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا "تقسیم کرنا پاکستان سے سیکھو"۔ ہندستان اسپیشل میں لکھا تھا ہندی میں "بدلہ لینا ہندستان سے سیکھو"۔ اس پر ہندوؤں اور سکھوں کو بڑا طیش آیا۔ ظالموں نے ہمارے بھائیوں کے ساتھ کتنا بُرا سلوک کیا ہے۔ ہائے یہ ہمارے ہندو اور سکھ پناہ گزیں۔ اور واقعی ان کی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔ انھیں فوراً گاڑی سے نکال کر پناہ گزینوں کے کیمپ میں پہونچایا گیا۔ اور سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی گاڑی پر دھاوا بول دیا یعنی اگر نہتے نیم مردہ مہاجرین پر حملہ کو "دھاوا" کہہ سکتے ہیں تو واقعی یہ دھاوا تھا۔ آدھے سے زیادہ آدمی مار ڈالے گئے۔ تب کہیں جاکر ملٹری نے حالات پر قابو پایا۔

گاڑی میں ایک بُڑھیا عورت بیٹھی تھی۔ اور اس کی گود میں اس کا ننھا پوتا تھا۔ راستے میں اس کا بیٹا مارا گیا۔ اس کی بہو کو جاٹ اٹھاکر لے گئے تھے۔ اس کے خاوند کو لوگوں نے بھالوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ اب وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کے لبوں پر آہیں نہ تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ اس کے دل میں دھاڑ نہ تھی۔ اس کے ایمان میں قوت نہ تھی۔ وہ پتھر کا بُت بنی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جیسے وہ کچھ سُن نہ سکتی تھی کچھ دیکھ نہ سکتی تھی۔ کچھ محسوس نہ کرسکتی تھی۔

بچے نے کہا۔ "دادی اماں پانی"

دادی چپ رہی۔

بچہ چیخا۔ "دادی اماں پانی"۔

دادی نے کہا "بیٹا پاکستان آئے گا تو پانی ملے گا؟

بچے نے کہا۔ "دادی اماں کیا ہندستان میں پانی نہیں ہے"؟

دادی نے کہا "بیٹا اب ہمارے دیس میں پانی نہیں ہے"۔

بچے نے کہا "کیوں نہیں ہے؟ مجھے پیاس لگی ہے۔ میں تو پانی پیوں گا۔ پانی، پانی، پانی، دادی اماں پانی پیوں گا۔ میں پانی پیوں گا"۔

"پانی پیوگے؟" ایک اکالی رضاکار وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے بچے کی طرف دیکھ کے کہا۔

"پانی پیوگے نا؟"

"ہاں" بچے نے سر ہلایا۔

"نہیں نہیں" دادی نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ "یہ کچھ نہیں کہتا آپ کو، یہ کچھ نہیں مانگتا آپ سے۔ خدا کے لیے سردار صاحب اسے چھوڑ دیجئے۔ میرے پاس اب کچھ نہیں ہے۔"

اکالی رضاکار ہنسا۔ اس نے پائیدان سے رستے ہوئے خون کو اپنی اوک میں جمع کیا اور اسے بچے کے قریب لے جا کے کہنے لگا۔

"لو۔ پیاس لگی ہے۔ تو یہ پی لو۔ بڑا اچھا خون ہے۔ مسلمان کا خون ہے"

دادی پیچھے ہٹ گئی۔ بچہ رونے لگا۔ دادی نے بچے کو اپنے میلے دوپٹے سے ڈھک لیا۔ اور اکالی رضاکار ہنستا ہوا آگے چلا گیا۔ دادی سوچنے لگی۔ کب یہ گاڑی چلے گی۔ میرے اللہ پاکستان کب آئے گا؟

ایک ہندو پانی کا گلاس لے کر آیا۔ "لو پانی پلا دو اسے"۔

لڑکے نے اپنی بانہیں آگے بڑھائیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اس کی آنکھیں باہر نکلی پڑتی تھیں۔ اس کے جسم کا رواں رواں پانی مانگ رہا تھا۔

ہندو نے گلاس ذرا پیچھے سرکا لیا۔ بولا۔ اس پانی کی قیمت ہے۔ مسلمان بچے کو

پانی مفت نہیں ملتا۔ اس گلاس کی قیمت پچاس روپے ہے۔"

"پچاس روپے" دادی نے عاجزی سے کہا۔ "بیٹا میرے پاس تو چاندی کا ایک چھلا بھی نہیں ہے۔ میں پچاس روپے کہاں سے دوں گی؟"

"پانی، پانی، تو پانی مجھے دو۔ پانی کا گلاس مجھے دے دو۔ دادی اماں دیکھو یہ ہمیں پانی پینے نہیں دیتا۔"

"مجھے دو۔ مجھے دو" ایک دوسرے مسافر نے کہا۔ "لو میرے پاس پچاس روپے ہیں۔"

ہندو ہنسنے لگا۔ "یہ پچاس روپے تو بچے کے لیے تھے۔ تمہارے لیے اس گلاس کی قیمت سو روپے ہے۔ سو روپے دو اور یہ پانی کا گلاس پی لو۔"

"اچھا یہ سو روپیہ ہی لے لو۔ یہ لو۔"

دوسرے مسلمان مسافر نے سو روپیہ ادا کر کے گلاس لے لیا۔ اور اسے غٹاغٹ پینے لگا۔

بچہ اسے دیکھ کے اور بھی چلانے لگا۔ پانی۔ پانی۔ دادی اماں پانی

"ایک گھونٹ اسے بھی دے دو، خدا اور رسول کے لیے۔"

مسلمان کا فر نے گلاس خالی کر کے اپنی آنکھیں بند کر لیں، گلاس اس کے ہات سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ اور پانی کی چند بوندیں فرش پر بکھر گئیں۔

بچہ گود سے اتر کر فرش پر چلا گیا۔ پہلے اس نے خالی گلاس کو چاٹنے کی کوشش کی۔ پھر فرش پر گری ہوئی چند بوندوں کو، پھر زور زور سے چلانے لگا۔ دادی اماں پانی۔ پانی۔"

پانی موجود تھا۔ اور پانی نہیں تھا۔ ہندو پناہ گزیں پانی پی رہے تھے، اور مسلمان پناہ گزیں پیاسے تھے۔ پانی موجود تھا اور مشکوں کی قطاریں اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سجی ہوئی تھیں اور پانی کے نل کھلے تھے۔ اور بھنگی آبدست کے لیے پانی ہندو مسافروں کو دے رہے تھے۔ لیکن پانی نہیں تھا تو مسلمان مہاجرین کے لیے۔ کیونکہ پنجاب کے نقشے پر ایک کالی موت کی لکیر کھینچ گئی تھی اور کل کا بھائی آج دشمن ہو گیا تھا۔ اور کل جس کو ہم نے بہن کہا تھا آج وہ ہمارے لیے طوائف سے بھی بدتر تھی۔ اور کل جو ماں تھی آج بیٹے نے اس کو ڈائن سمجھ کر اس کے گلے پر چھری پھیر دی تھی۔ پانی ہندستان میں تھا اور پانی پاکستان میں بھی تھا۔ لیکن پانی کہیں نہیں تھا۔ کیونکہ آنکھوں کا پانی مر گیا تھا۔ اور یہ دونوں ملک نفرت کے صحرا بن گئے تھے۔ اور ان کی تپتی ہوئی ریت پر چلتے ہوئے کارواں بادِ سموم کی بربادیوں کے شکار ہو گئے تھے۔ پانی تھا مگر سراب تھا۔ جس دیس میں لسی اور دودھ پانی کی طرح بہتے تھے، وہاں آج پانی نہیں تھا۔ اور اس کے بیٹے پیاس سے بلک بلک کر مر رہے تھے۔ لیکن دل کے دریا سوکھ گئے تھے، اس لیے پانی تھا اور نہیں بھی تھا۔

پھر آزادی کی رات آئی۔ دیوالی پر بھی ایسا چراغاں نہیں ہوتا، کیونکہ دیوالی پر تو صرف دیے جلتے ہیں۔ یہاں گھروں کے گھر جل رہے تھے۔ دیوالی پر آتش بازی ہوتی ہے، پٹاخے چھوٹتے ہیں۔ یہاں بمب پھٹ رہے تھے اور مشین گنیں چل رہی تھیں۔ انگریزوں کے راج میں ایک پستول بھی بھولے سے کہیں نہیں ملتا تھا۔ اور آزادی کی پہلی ہی رات نہ جانے کہاں سے اتنے سارے بمب، ہینڈ گرینیڈ، مشین گن

اسٹین گن۔ برین گن ٹیک پڑے۔ یہ اسلحہ جات برطانوی اور امریکی کمپنیوں کے بنائے ہوئے تھے۔ اور آج آزادی کی رات ہندستانیوں اور پاکستانیوں کے دل چھید رہے تھے۔ لڑے جاؤ بہادرو۔ مرے جاؤ بہادرو۔ ہم اسلحہ جات تیار کریں گے۔ تم لوگ لڑو گے شاباش بہادرو۔ دیکھنا کہیں ہمارے گولہ بارود کے کارخانوں کا منافع کم نہ ہو جائے۔ گھمسان کا رن رہے تو مزا ہے۔ چین والے لڑتے ہیں تو ہندستان اور پاکستان والے کیوں نہ لڑیں۔ وہ بھی ایشیائی ہیں، تم بھی ایشیائی ہو۔ ایشیا کی عزت برقرار رکھو۔ لڑتے جاؤ بہادرو۔ تم نے لڑنا بند کیا تو ایشیا کا رُخ دوسری طرف پلٹ جائے گا۔ اور پھر ہمارے کارخانوں کے منافعے اور حصّے اور ہماری سامراجی خوش حالی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لڑے جاؤ بہادرو۔ پہلے تم ہمارے ملکوں سے کپڑا اور شیشے کا سامان اور عطریات منگاتے تھے، اب ہم تمھیں اسلحہ جات بھیجیں گے۔ اور ٹینک اور ہوائی جہاز اور کارتوس۔ کیونکہ اب تم آزاد ہو گئے ہو۔

مسلح ہندو اور سکھ رضاکار مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا رہے تھے اور جے ہند کے نعرے گونج رہے تھے۔ مسلمان اپنے گھروں کی کمین گاہوں میں چھپ کر حملہ آوروں پر سٹین گنوں سے حملہ کر رہے تھے اور ہینڈ گرینیڈ پھینکتے تھے۔

آزادی کی رات اور اس کے تین چار روز بعد تک اس طرح مقابلہ رہا۔ پھر سکھوں اور ہندوؤں کی مدد کے لیے آس پاس کی ریاستوں سے رضاکار پہنچ گئے۔ اور مسلمانوں نے اپنے گھر خالی کرنے شروع کیے۔ گھر، محلے، بازار جل رہے تھے۔ ہندوؤں کے گھر اور مسلمانوں کے گھر۔ اور سکھوں کے گھر، لیکن آخر میں مسلمانوں کے گھر سب سے زیادہ جلے اور آخر ہزاروں کی تعداد میں مسلمان اکٹھے ہو کر شہر سے بھاگنے

لگے۔ اس موقع پر جو کچھ ہوا اسے تاریخ میں "امرتسر کا قتل عام" کہا جائے گا۔ لیکن ملٹری نے حالات پر جلد قابو پا لیا۔ قتل عام بند ہوا اور ہندو اور مسلمان دو مختلف کیمپوں میں بند ہو کر پناہ گزین کہلانے لگے۔ ہندو "شرنارتھی" کہلاتے تھے اور مسلمان پناہ گزین "مہاجرین"، گو مصیبت دونوں پر ایک ہی تھی، لیکن ان کے نام الگ الگ کر دیے تھے تاکہ مصیبت میں بھی یہ لوگ اکٹھے نہ ملیں۔ دونوں کیمپوں پر نہ چھت تھی نہ روشنی کا انتظام تھا نہ سونے کے لیے بستر تھے نہ پاخانے، لیکن ایک کیمپ ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کا کیمپ کہلاتا تھا دوسرا مسلمان مہاجرین کا۔

ہندو شرنارتھیوں کے کیمپ میں آزادی کی رات کو شدید بخار میں لرزتی ہوئی ایک ماں اپنے بیمار بیٹے کے سامنے دم توڑ رہی تھی، یہ لوگ مغربی پنجاب سے آئے پندرہ آدمیوں کا خاندان تھا۔ پاکستان سے ہندوستان آتے آتے صرف دو افراد رہ گئے تھے، اور اب ان میں بھی ایک بیمار تھا۔ دوسرا دم توڑ رہا تھا۔ جب یہ پندرہ افراد کا قافلہ گھر سے چلا تھا۔ تو ان کے پاس بستر تھے۔ سامان خورد و نوش تھا۔ کپڑوں سے بھرے ہوئے ٹرنک تھے۔ روپیوں کی پوٹلیاں تھیں اور عورتوں کے جسموں پر زیور تھے۔ لڑکے کے پاس ایک بائیسکل تھی، اور یہ سب پندرہ آدمی تھے۔

گجرانوالے تک پہونچتے پہونچتے دس آدمی رہ گئے۔ پہلے روپیہ گیا، پھر زیور، پھر عورتوں کے جسم۔

لاہور آتے آتے چھ آدمی رہ گئے، کپڑوں کے ٹرنک گئے، اور بستر بھی اور لڑکے کو اپنی بائیسکل کے چھن جانے کا بڑا افسوس تھا۔

اور جب فلپور سے آگے بڑھے تو صرف دو رہ گئے، ماں اور ایک بیٹا

اور ایک لحاف جو دم توڑتی ہوئی عورت لرزے کے بخار میں اس وقت اوڑھے ہوئے تھی۔ اس وقت آدھی رات کے وقت، آزادی کی پہلی رات کو وہ عورت مر رہی تھی اور اس کا بیٹا چپ چاپ، اس کے سرہانے بیٹھا ہوا بخار سے کانپ رہا تھا اور اس کی کٹی کٹی سندھی ہوئی تھی، اور آنسو ایک مدت ہوئی ختم ہو چکے تھے۔

اور جب اس کی ماں مرگئی تو اس نے آہستہ سے لحاف کو اس کے جسم سے الگ کیا اور اسے اوڑھ کر کیمپ کے دوسرے کونے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک رضا کار اس کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا "وہ ..... ادھر ..... تمہاری ماں تھی، جو مرگئی ہے؟"

"نہیں نہیں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ وہ کون تھی" لڑکے نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ اور زور سے لحاف کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے بولا "وہ میری ماں نہیں تھی۔ یہ لحاف میرا ہے۔ یہ لحاف میرا ہے۔ میں یہ لحاف نہیں دوں گا۔ یہ لحاف میرا ہے" وہ زور زور سے چیخنے لگا۔ "وہ میری ماں نہیں تھی۔ یہ لحاف میرا ہے۔ میں اسے کسی کو نہ دوں گا۔ یہ لحاف میں ساتھ لایا ہوں، نہیں دوں گا۔ نہیں! ایک لحاف، ایک ماں، ایک مردہ انسانیت۔ کسے معلوم تھا کہ ایک دن اس نئی تثلیث کی کہانی بھی مجھے آپ کو سنانی پڑے گی۔

جب مسلمان بھاگ گئے تو ان کے گھر لٹنے شروع ہو گئے۔ شاید ہی کوئی شریف آدمی ایسا ہو جس نے اس لوٹ میں حصہ نہ لیا ہو۔ آزادی کے تیسرے دن کی بات ہے۔ میں اپنی گائے کو گلی کے باہر نل پر پانی پلانے کے جا رہا تھا۔ بالٹی میرے

ہاتھ میں تھی۔ دوسرے ہاتھ میں گائے کے گلے سے بندھی ہوئی رسی تھی۔ گلی کے موڑ پر پہونچ کر میں نے میونسپلٹی کے لیمپ والے کھمبے سے گائے کو باندھ دیا اور نل کی جانب بالٹی لیے مڑ گیا کہ بالٹی میں پانی بھر لاؤں، تھوڑی دیر کے بعد جب بالٹی بھر کے لایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گائے غائب ہے! ادھر ادھر بہترا دیکھا لیکن گائے کہیں نظر نہ آئی یکایک میری نگاہ ساتھ والے مکان کے آنگن میں گئی، دیکھتا ہوں، تو گائے آنگن میں بندھی کھڑی ہے۔

میں گھر میں گھسا۔

"کیا ہے بھئی۔ کون ہو تم؟" ایک سردار صاحب نے نہایت رعونت سے کہا۔

میں نے کہا۔ "میں ابھی اپنی گائے کو اس سے باندھ کر نل پر پانی لانے گیا تھا یہ گائے تو میری ہے سردار جی"

سردار جی مسکرائے "ہا! ہا! ہا کوئی گل نہیں۔ میں نے سمجھا کسی مسلمان کی گائے ہو۔ یہ آپ کی گائے ہے۔ تو پھر لے جائیے۔" اتنا کہہ کر انھوں نے گائے کی رسی کھول کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔

"معاف کرنا" میرے چلتے چلتے انھوں نے پھر کہا۔ "اپاں سمجھیا کسی مسلمان دی گائے ہے۔"

میں نے یہ واقعہ اپنے دوست سردار سندر سنگھ سے بیان کیا تو وہ بہت ہنسا۔ "بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہو"؟ میں نے اس سے پوچھا تو وہ اور بھی زور زور سے

ہنسنے لگا۔ سندر سنگھ میں آپ کو بتا دوں، اشتراکی ہے، اس لیے فرقہ وارانہ عناد سے بہت دور رہتا ہے۔ وہ میرے ان چند احباب میں سے ہے جنھوں نے اس لوٹ مار میں بالکل کوئی حصہ نہیں لیا۔

میں نے کہا "تم اسے اچھا سمجھتے ہو؟"

وہ بولا "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میں ہنس رہا تھا کیونکہ آج صبح ایک ایسا ہی واقعہ مجھے پیش آیا۔ میں حال بازار میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے سوچا سامنے کٹڑے میں سے سردار سوہرا سنگھ جی کو دیکھتا چلوں۔ پرانے غدر پارٹی کے لیڈر ہیں نا وہ۔ انھوں نے اپنے گاؤں میں تین چار سو مسلمانوں کو پناہ دے رکھی ہے، سوچا پوچھتا چلوں، ان کا کیا ہوا۔ انہیں وہاں سے نکال کر مہاجرین کے کیمپ میں لے جانے کی کیا سبیل کی جائے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی گاڑی محمد رزاق جوتے والے کی دوکان (جو اب لٹ چکی ہے) کے آگے کھڑی کی اور کٹڑے میں گھس گیا۔ چند منٹ کے بعد ہی لوٹ کر آ گیا کیونکہ باباجی گھر پر ملے نہیں۔ آ کے دیکھتا ہوں تو گاڑی غائب ہے۔ ابھی تو یہیں چھوڑی تھی! پوچھنے پر بھی کوئی نہیں بتاتا۔ اتنے میں میری نظر حال بازار کے آخری کونے پر پڑی۔ وہاں میری گاڑی کھڑی تھی لیکن ایک جیپ کے پیچھے بندھی ہوئی۔ میں بھاگا بھاگا وہاں گیا۔ جیپ میں سردار سنگھ شتر قومی کارکن بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

"اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔"

"اور یہ میری موٹر بھی کیا تمھارے گاؤں جائے گی؟"

"کون سی موٹر؟ ...... وہ جو پیچھے بندھی ہوئی ہے؟ یہ تمھاری موٹر ہے؟

معاف کرنا پیارے، میں نے پہچانی نہیں۔ وہ محمد رزاق کی دکان کے سامنے کھڑی تھی نا۔ میں نے سوچا کسی مسلمان کی ہوگی۔ میں نے جیپ کے پیچھے باندھ لیا۔ ہاہاہا! میں تو اسے اپنے گھر لے جارہا تھا۔ اچھا ہوا کہ تم وقت پر آگئے۔"

"اور اب کہاں جاؤ گے؟" میں نے اپنی موٹر کھول کر اس میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اب؟..... اب کہیں اور جاؤں گا۔ کہیں نہ کہیں سے کوئی مال مل ہی جائے گا۔"
سردار سنگھ قومی کارکن ہیں۔ جیل جاچکے ہیں۔ جرمانے ادا کرچکے ہیں۔ سیاسی آزادی کے حصول کے لیے قربانیاں دے چکے ہیں!

یہ واقعہ سنا کر سندر سنگھ نے کہا۔ ہر دبا۔

اس حد تک پھیل گئی ہے کہ ہمارے اچھے قومی کارکن بھی اس سے محفوظ نہیں رہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں میں کام کرنے والے طبقے کا ایک جزو خود اس لوٹ مار قتل و غارت گری میں شریک ہو۔ اس رو کو اگر اسی وقت روکا نہ گیا تو دونوں جماعتیں فنا ہو جائیں گی۔ یہی کوئی دو چار سال ہی میں۔

سندر سنگھ کا چہرہ متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کے چلا آیا۔ راستے میں خالصہ کالج روڈ پر ایک مسلمان امیر کی کوٹھی لوٹی جارہی تھی، اسباب کے لدے ہوئے چھکڑے مختلف گروہ لے جارہے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے چند منٹوں میں سب معاملہ ختم ہوگیا۔ سڑک پر چلنے والے ہندو اور سکھ راہ گیر بھی کوٹھی کی طرف بھاگے۔ لیکن پولیس کے سپاہیوں کو وہاں سے نکلتے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

پولیس کے سپاہیوں کے ہاتھوں میں چند جرابیں تھیں۔ اور ریشمی ٹائیاں۔ ایک کوٹ ہینگر پر مفلر پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے مسکرا کر لوگوں سے کہا۔ "اب کہاں جاتے ہو۔

وہاں تو سب کچھ پہلے ہی ختم ہو چکا۔

ایک مہاشے جو شکل و صورت سے آریہ سماجی معلوم ہوتے تھے اور میرے سامنے ہی کوٹھی کی طرف بھاگے تھے، اب مڑ کر میری طرف دیکھ کر کہنے لگے،

"دیکھئے صاحب، دنیا کیسی پاگل ہو گئی ہے۔"

میرے قریب سے ایک دودھ بیچنے والا بھیّا گزرا، بیچارے کے حصے میں چند کتابیں آئی تھیں۔ وہ انھیں لیے جا رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "ان کتابوں کا کیا کرو گے، پڑھ سکتے ہو"؟

"نا بابوجی"

"پھر؟"

اس نے کتابوں کی طرف غصے سے دیکھا۔ بولا۔ "ہم کیا کریں بابو۔ جدھر جاتے ہیں۔ لوگ پہلے ہی اچھا اچھا سامان اٹھا لے جاتے ہیں۔ ہماری تو قسمت خراب ہے بابو۔"

اس نے پھر کتابوں کو غصے سے دیکھا۔ اس کا ارادہ تھا۔ انھیں یہیں سڑک پر پھینک دے۔ پھر اس کا ارادہ بدل گیا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ "کوئی بات نہیں۔ یہ موٹی موٹی کتابیں چولھے میں خوب جلیں گی۔ رات کے بھوجن کے لیے لکڑیوں کی جرورت نہیں!"

بڑی اچھی کتابیں تھیں۔ سب چولھے میں گئیں۔ ارسطو، سقراط، افلاطون، روسو، شیکسپیر، سب چولھے میں گئے۔

سہ پہر کے قریب بازار سنسان پڑنے لگے، کرفیو ہونے والا تھا۔ میں جلدی جلدی کوچۂ رام داس سے نکلا اور مقدس گوردوارے کو تعظیم دیتا ہوا اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ راستے میں اندھیری گلی پڑتی ہے۔ جہاں جلیان والے باغ کے روز لوگوں کو گھٹنوں کے بل چلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا میں اس گلی سے کیوں نہ نکل جاؤں، یہ راستہ ٹھیک رہے گا۔ میں اسی گلی کی طرف گھوم گیا۔

یہ گلی تنگ ہے اور یہاں دن کو بھی اندھیرا سا رہتا ہے، یہاں مسلمانوں کے آٹھ دس گھر تھے وہ سب جلا دیے گئے تھے یا لوٹے گئے تھے، دروازے کھلے تھے، کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی، کہیں کہیں چھتیں جلی ہوئیں۔ گلی میں سناٹا تھا۔ گلی کے فرش پر عورتوں کی لاشیں پڑی تھیں۔

میں پلٹنے لگا۔ اتنے میں کسی کے کراہنے کی آواز آئی، گلی کے بیچ میں لاشوں کے درمیان ایک بڑھیا رینگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے سہارا دیا۔

"پانی، بیٹا!"

میں اوک میں پانی لایا۔ مقدس گوردوارے کے سامنے پانی کا نل تھا۔ میں نے اپنی اوک اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔

"تم پر خدا کی رحمت ہو بیٹا! تم کون ہو؟ خیر تم جو کوئی بھی ہو۔ تم پر خدا کی رحمت ہو بیٹا۔ یہ ایک مرنے والی کے الفاظ ہیں۔ انھیں یاد رکھنا۔"

میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تمھیں کہاں چوٹ آئی ہے ماں؟"

بڑھیا نے کہا "مجھے مت اٹھاؤ۔ میں یہیں مروں گی۔ اپنی بہو بیٹیوں کے

درمیان، کیا کیا تم نے، چوٹ۔ ارے بیٹا یہ چوٹ بہت گہری ہے۔ یہ گھاؤ دل کے اندر ہے بہت گہرا گھاؤ ہے۔ تم لوگ اس سے کیسے نپٹ سکو گے؟ تمہیں خدا کیسے معاف کرے گا؟"

"ہمیں معاف کر دو ماں"

مگر بڑھیا نے کچھ نہیں سنا۔ وہ آپ ہی آپ کہتی جا رہی تھی "پہلے انھوں نے ہمارے مردوں کو مارا پھر ہمارے گھر لوٹے۔ پھر ہمیں گھسیٹ کر گلی میں لے آئے، اور اس گلی میں اس فرش پر۔ اس مقدس گوردوارے کے سامنے جسے میں ہر روز تعظیم دیا کرتی انھوں نے ہماری عصمت دری کی۔ اور پھر ہمیں گولی سے مار دیا میں تو ان کی دادیوں کے ہم عمر تھی، انھوں نے مجھے بھی معاف نہیں کیا۔"

یکایک اس نے مجھے آستین سے پکڑ لیا۔ "تو جانتا ہے۔ یہ امرتسر کا شہر ہے۔ یہ میرا شہر ہے، اس مقدس گوردوارے کو میں روز سلام کرتی تھی جیسے اپنی مسجد کو روز سلام کرتی ہوں، میری گلی میں ہندو، مسلمان، سکھ بھی بستے ہیں۔ اور کئی پشتوں سے ہم لوگ یہاں بستے چلے آئے ہیں اور ہم ہمیشہ ہمیشہ محبت سے اور پیار سے اور صلح سے رہے۔ اور کبھی کچھ نہیں ہوا۔"

"میرے ہم مذہبوں کو معاف کر دو اماں!"

"تو جانتا ہے میں کون ہوں؟ میں زینب کی ماں ہوں، تو جانتا ہے زینب کون تھی؟ زینب وہ لڑکی تھی جس نے جلیان والے روز اس گلی میں گوروں کے آگے سر نہیں جھکایا۔ جو اپنے ملک اور اپنی قوم کے لیے سر اونچا کیے اس گلی میں سے گزر گئی۔ یہی وہ گلی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں زینب شہید ہوئی تھی۔

میں اسی زینب کی ماں ہوں، میں ایسی آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑنے والی

نہیں ہوں، مجھے سہارا دو، مجھے کھڑا کر دو، میں اپنی لٹی ہوئی آبرو اور اپنی بہو بیٹیوں کی برباد عصمتیں لے کر سیاست دانوں کے پاس جاؤں گی۔ مجھے سہارا دو۔ میں ان سے کہوں گی، میں زینب کی ماں ہوں۔ میں امرت سر کی ماں ہوں، میں پنجاب کی ماں ہوں، تم نے میری گود اجاڑی ہے۔ تم نے بڑھاپے میں میرا منہ کالا کیا ہے، میری جوان جہان بہوؤں اور بیٹیوں کی پاک و صاف روحوں کو جہنم کی آگ میں جھونکا ہے، میں ان سے پوچھوں گی کہ کیا زینب اسی آزادی کے لیے قربان ہوئی تھی؟ میں .... زینب کی ماں ہوں!" یکایک وہ میری گود میں جھک گئی۔ اس کے منہ سے خون اُبل پڑا۔ دوسرے لمحے میں اس نے جان دے دی۔

زینب کی ماں میری گود میں مری پڑی تھی۔ اور اس کا لہو میری قمیص پر ہے اور میں زندگی سے موت کے دروازے جھانک رہا ہوں۔ اور تخیل میں صدیق اور ادم پرکاش اُبھرتے چلے آتے ہیں اور زینب کا غرور کا سر فضا میں اُبھرتا چلا آتا ہے، اور شہید مجھ سے کہتے ہیں کہ ہم پھر آئیں گے، صدیق، ادم پرکاش ہم پھر آئیں گے۔ شام کور، زینب، بادو، بیگم، ہم پھر آئیں گے اپنی عصمتوں کا تقدس لیے ہوئے اپنی بے داغ روحوں کا عزم لیے ہوئے کیونکہ ہم انسان ہیں۔ ہم اس ساری کائنات میں تخلیق کے علم بردار ہیں۔ اور کوئی تخلیق کو مار نہیں سکتا۔ کوئی اس کی عصمت دری نہیں کر سکتا، کوئی اسے لوٹ نہیں سکتا، کیونکہ ہم تخلیق ہیں۔ اور تم تخریب ہو۔ تم وحشی ہو، تم درندے ہو، تم مر جاؤ گے لیکن ہم نہیں مریں گے۔ کیونکہ انسان کبھی نہیں مرتا، وہ درندہ نہیں ہے۔ وہ نیکی کی روح ہے، خدائی کا حامل ہے۔ کائنات کا غرور ہے۔

پیشاور ایکسپریس

جب میں پشاور سے چلی تو میں نے چھکا چھک اطمینان کا سانس لیا۔ میرے ڈبوں میں زیادہ تر ہندو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ پشاور سے، ہوتی مردان سے، کوہاٹ سے، چارسدہ سے، خیبر سے، لنڈی کوتل سے، بنوں نوشہرہ سے، مانسہرہ سے آئے تھے اور پاکستان میں جان و مال کو محفوظ نہ پاکر ہندستان کا رخ کر رہے تھے، اسٹیشن پہ زبردست پہرہ تھا، اور فوج والے بڑی چوکسی سے کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو جو پاکستان میں پناہ گزیں اور ہندستان میں شرنارتھی کہلاتے تھے اس وقت تک چین کا سانس نہ آیا جب تک میں نے پنجاب کی رومان خیز سرزمین کی طرف قدم نہ بڑھائے، یہ لوگ شکل و صورت سے بالکل پٹھان معلوم ہوتے تھے، گورے چٹے مضبوط ہاتھ پاؤں، سر پہ کلاہ اور لنگی۔ اور جسم پر قمیص اور شلوار، یہ لوگ پشتو میں بات کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی نہایت کرخت قسم کی پنجابی میں بات کرتے تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے ہر ڈبے میں دو سپاہی بندوقیں لے کر کھڑے تھے۔ وجیہہ بلوچی سپاہی اپنی پگڑیوں کے عقب مور کے چھتر کی طرح خوبصورت طرّے

لگائے ہوئے ہاتھ میں جدید رائفلیں لیے ہوئے ان پٹھانوں اور ان کے بیوی بچوں کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے جو ایک تاریخی خوف اور شر کے زیر اثر اس سرزمین سے بھاگے جا رہے تھے جہاں وہ ہزاروں سال سے رہتے چلے آئے تھے۔ جس کی سنگلاخ سرزمین سے انھوں نے توانائی حاصل کی تھی۔ جس کے برفاب چشموں سے انھوں نے پانی پیا تھا۔ آج یہ وطن یک لخت بیگانہ ہو گیا تھا، اور اس نے اپنے مہربان سینے کے کواڑ ان پر بند کر دیے تھے اور وہ ایک نئے دیس کے تپتے ہوئے میدانوں کا تصور دل میں لیے با دل ناخواستہ وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ اس امر کی مسرت ضرور تھی کہ ان کی جانیں بچ گئی تھیں۔ ان کا بیت سامال و متاع اور ان کی بہوؤں، بیٹیوں، ماؤں اور بیویوں کی آبرو محفوظ تھی۔ لیکن ان کا دل رو رہا تھا۔ اور آنکھیں سرحد کے پتھریلے سینے پر یوں گڑی ہوئی تھیں گویا اسے چیر کر اندر گھس جانا چاہتی ہیں اور اس کے شفقت بھرے ماتا کے فوارے سے پوچھنا چاہتی ہیں، بول ماں آج کس جرم کی پاداش میں تو نے اپنے بیٹوں کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اپنی بہوؤں کو اس خوبصورت آنگن سے محروم کر دیا ہے، جہاں وہ کل تک سہاگ کی رانیاں بنی بیٹھی تھیں۔ اپنی البیلی کنواریوں کو جو انگور کی بیل کی طرح تیری چھاتی سے لپٹ رہی تھیں جھنجھوڑ کر الگ کر دیا ہے۔ کس لیے آج یہ دیس بدیس ہو گیا ہے۔ میں چلتی جا رہی تھی اور ڈبوں میں بیٹھی ہوئی مخلوق اپنے وطن کی سطح مرتفع اس کے بلند و بالا چٹانوں، اس کے مرغزاروں، اس کی شاداب وادیوں، کنجوں، اور باغوں کی طرف یوں دیکھ رہی تھی، جیسے ہر جانے پہچانے منظر کو اپنے سینے میں چھپا کر لے جانا چاہتی ہو۔ جیسے نگاہ ہر لحظہ رک جائے، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس عظیم رنج و الم کے بارے میرے قدم بھاری ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ریل کی پٹری مجھے

جواب دیے جا رہی ہے۔

حسن ابدال تک لوگ یوں ہی محزون، افسردہ، یاس و نکبت کی تصویر بنے رہے۔ حسن ابدال کے اسٹیشن پر بہت سے سکھ آئے ہوئے تھے۔ پنجہ صاحب سے لمبی لمبی کرپانیں لیے۔ چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی۔ بال بچے سہمے سہمے سے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی ہی تلوار کے گھاؤ سے یہ لوگ خود مر جائیں گے۔ ڈبوں میں بیٹھ کر ان لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور پھر دوسرے سرحد کے ہندو اور سکھ پٹھانوں سے گفتگو شروع ہو گئی کسی کا گھر بار جل گیا تھا۔ کوئی صرف ایک قمیص اور شلوار میں بھاگا تھا۔ کسی کے پاؤں میں جوتی نہ تھی، اور کوئی اتنا ہوشیار رہا تھا کہ اپنے گھر کی ٹوٹی چارپائی تک اٹھا لایا تھا۔ جن لوگوں کا واقعی بہت نقصان ہوا تھا وہ لوگ گم سم بیٹھے ہوئے تھے۔ خاموش، چپ چاپ اور جس کے پاس کبھی کچھ نہ ہوا تھا وہ اپنی لاکھوں کی جائداد کھونے کا غم کر رہا تھا۔ اور دوسروں کو اپنی فرضی امارت کے قصے سنا سنا کر مرعوب کر رہا تھا۔ اور مسلمانوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ بلوچی سپاہی ایک پروقار انداز میں دروازوں پر رائفلیں تھامے کھڑے تھے اور کبھی کبھی ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرا اٹھتے۔

ٹیکسلا کے اسٹیشن پر مجھے بہت عرصے تک کھڑا رہنا پڑا، نہ جانے کس کا انتظار تھا، شاید آس پاس کے گاؤں سے ہندو پناہ گزیں آ رہے تھے، جب گارڈ نے اسٹیشن ماسٹر سے بار بار پوچھا تو اس نے کہا۔ یہ گاڑی آگے نہ جا سکے گی۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ اب لوگوں نے اپنا سامان خورد و نوش کھولا اور کھانے لگے سہمے سہمے بچے قہقہے لگانے لگے اور معصوم کنواریاں دریچوں سے باہر جھانکنے لگیں۔ اور بڑے بوڑھے حقے گڑگڑانے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد دور سے شور سنائی دیا۔ اور ڈھولوں کے پیٹنے کی آوازیں

سنائی دینے لگیں۔
ہندو پناہ گزینوں کا جتھا آ رہا تھا شاید۔ لوگوں نے سر نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔
جتھا دور سے آ رہا تھا اور نعرے لگا رہا تھا۔ وقت گزرتا گیا جتھا قریب آتا گیا، ڈھولوں
کی آواز تیز ہوتی گئی۔ جتھے کے قریب آتے ہی گولیوں کی آواز کانوں میں آئی اور لوگوں
نے اپنے سر کھڑکیوں سے پیچھے ہٹا لیے۔ یہ ہندوؤں کا جتھا تھا جو آس پاس کے گاؤں سے
آ رہا تھا۔ گاؤں کے مسلمان لوگ لیے اپنی حفاظت میں لا رہے تھے۔ چنانچہ ہر ایک مسلمان
نے ایک مسافر کی لاش اپنے کندھے پر اٹھا رکھی تھی، جس نے جان بچا کر گاؤں سے بھاگنے
کی کوشش کی تھی۔ دو سو لاشیں تھیں۔ مجمع نے یہ لاشیں نہایت اطمینان سے اسٹیشن پہنچ
کر بلوچی دستے کے سپرد کیں۔ اور کہا کہ وہ ان مہاجرین کو نہایت حفاظت سے ہندوستان
کی سرحد پر لے جائے۔ چنانچہ بلوچی سپاہیوں نے نہایت خندہ پیشانی سے اس بات کا ذمہ
لیا اور ہر ڈبے میں پندرہ بیس لاشیں رکھ دی گئیں۔ اس کے بعد مجمع نے ہوا میں فائر کیا۔
اور گاڑی چلانے کے لیے اسٹیشن ماسٹر کو حکم دیا۔ میں چلنے لگی تھی کہ پھر مجھے روک دیا گیا اور
مجمع کے سرغنے نے ہندو پناہ گزینوں سے کہا کہ دو سو آدمیوں کے چلے جانے سے ان کے
گاؤں ویران ہو جائیں گے اور ان کی تجارت تباہ ہو جائے گی اس لیے وہ گاڑی میں سے
دو سو آدمی اتار کر اپنے گاؤں لے جائیں گے چاہے کچھ بھی ہو۔ وہ اپنے ملک کو یوں برباد
ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ اس پر بلوچی سپاہیوں نے ان کے تدبر کی اور ان کی فراست
طبع کی داد دی۔ اور ان کی وطن دوستی کو سراہا۔ چنانچہ اس پر بلوچی سپاہیوں نے ہر ڈبے
سے کچھ آدمی نکال کر مجمع کے حوالے کیے، پورے دو سو آدمی نکالے گئے۔ ایک کم نہ
ایک زیادہ۔

لائن گھاٹ کا فرد اسر غنہ نے کہا۔ سرغنہ اپنے علاقہ کا سب سے بڑا جاگیردار تھا۔
اور اپنے لوگوں کی روائی میں مقدس جہاد کی گونج سن رہا تھا۔

کافر پتھر کے بت بنے کھڑے تھے۔ مجمع کے لوگوں نے انھیں اٹھا اٹھا کر لائن میں کھڑا
کیا۔ دو سو آدمی، دو سو زندہ لاشیں، چہرے سُتے ہوئے۔ آنکھیں فضا میں تیروں کی بارش
سی محسوس کرتی ہوئی۔

پیل بلوچی سپاہیوں نے کی۔ پندرہ آدمی فائر سے گر گئے۔ یہ تکشیلا کا اسٹیشن
تھا۔

بیس اور آدمی گر گئے۔

یہاں ایشیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی۔ اور لاکھوں طالب علم اس تہذیب و
تمدن کے گہوارے سے کسب فیض کرتے تھے۔

پچاس اور مارے گئے۔

تکشیلا کے عجائب گھر میں اتنے خوبصورت بت تھے، اتنے حسین سنگ تراشی کے
نادر نمونے، قدیم تہذیب کے جھلملاتے ہوئے چراغ۔

پچاس اور مارے گئے۔

پس منظر میں سرکوپ کا محل تھا۔ اور کھیلوں کا امفی تھیٹر اور میلوں تک پھیلے
ہوئے ایک وسیع شہر کے کھنڈر۔ تکشیلا کی گذشتہ عظمت کے پرشکوہ منظر۔

تیس اور مارے گئے۔

یہاں کنشک نے حکومت کی تھی۔ اور لوگوں کو امن و آشتی اور حسن و دولت
سے مالامال کیا تھا۔

بچیں اور مارے گئے۔

یہاں بدھ کا نغمۂ عرفان گونجا تھا، یہاں بھکشوؤں نے امن و صلح و آشتی کا درسِ حیات دیا تھا۔

اب آخری گروہ کی اجل آگئی تھی۔

یہاں پہلی بار ہندستان کی سرحد پہ اسلام کا پرچم لہرایا تھا۔ مساوات اور اخوت اور انسانیت کا پرچم۔

سب مر گئے۔ اللہ اکبر۔ فرش خون سے لال تھا۔ اور جب میں پلیٹ فارم سے گذری تو میرے پاؤں ریل کی پٹری سے پھسلے جاتے تھے جیسے میں ابھی گر جاؤں گی۔ اور گر کر باقی ماندہ مسافروں کو بھی ختم کر ڈالوں گی۔

ہر ڈبے میں موت آگئی تھی اور لاشیں درمیان میں رکھ دی گئی تھیں۔ اور زندہ لاشوں کا ہجوم چاروں طرف تھا۔ اور بلوچی سپاہی مسکرا رہے تھے۔ کہیں کوئی بچہ رونے لگا۔ کسی بوڑھی ماں نے سسکی لی۔ کسی کے لٹے ہوئے سہاگ نے آہ کی، اور چیختی چلاتی راولپنڈی کے پلیٹ فارم پر آ کھڑی ہوئی۔

یہاں سے کوئی پناہ گزیں گاڑی میں سوار نہ ہوا۔ ایک ڈبے میں چند مسلمان نوجوان پندرہ بیس برقعہ پوش عورتوں کو لے کر سوار ہوئے۔ ہر نوجوان رائفل سے مسلح تھا۔ ایک ڈبے میں بہت سا سامانِ جنگ لادا گیا۔ مشین گنیں، اور کارتوس، پستول اور رائفلیں۔

جہلم اور گوجر خاں کے درمیانی علاقے میں مجھے سگنل کھینچ کر کھڑا کر دیا گیا۔ میں رک گئی۔ مسلح نوجوان گاڑی سے اُترنے لگے۔ برقعہ پوش خواتین نے شور

مچانا شروع کیا ہم ہندو ہیں۔ ہم سکھ ہیں۔ ہمیں زبردستی لے جا رہے ہیں۔ انھوں نے برقعے پھاڑ ڈالے اور چلانا شروع کیا۔ نوجوان مسلمان ہنستے ہوئے انھیں گھسیٹ کر گاڑی سے نکال لائے۔

ہاں یہ ہندو عورتیں ہیں، ہم انھیں راولپنڈی سے ان کے آرام دہ گھروں، ان کے خوش حال گھرانوں، ان کے عزت دار ماں باپ سے چھین کر لائے ہیں۔ اب یہ ہماری ہیں۔ ہم ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کریں گے۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو انھیں ہم سے چھین کر لے جائے۔

سرحد کے دو نوجوان ہندو پٹھان چھلانگ مار کر گاڑی سے اُتر گئے، بلوچی سپاہیوں نے نہایت اطمینان سے فائر کر کے انھیں ختم کر دیا۔ پندرہ بیس نوجوان اور نکلے، انھیں مسلح مسلمانوں کے گروہ نے منٹوں میں ختم کر دیا۔ دراصل گوشت کی دیوار لوہے کی گولی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ نوجوان ہندو عورتوں کو گھسیٹ کر جنگل میں لے گئے۔ اور میں منہ چھپا کر وہاں سے بھاگی۔ کالا، خوفناک سیاہ دھواں میرے منہ سے نکل رہا تھا جیسے کالک پر خباثت کی سیاہی چھا گئی تھی۔ اور سانس میرے سینے میں یوں الجھنے لگی جیسے یہ آہنی چھاتی ابھی پھٹ جائے گی۔ اور اندر بھڑکتے ہوئے لال لال شعلے اس جنگل کو خاک سیاہ کر ڈالیں گے، جو اس وقت میرے آگے پیچھے پھیلا ہوا تھا۔ اور جس نے ان پندرہ عورتوں کو چشم زدن میں نگل لیا تھا۔

لالہ موسیٰ کے قریب لاشوں سے اتنی مکروہ سڑاند نکلنے لگی کہ بلوچی سپاہی انھیں باہر پھینکنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے ایک آدمی کو بلاتے اور اس سے کہتے، اس کی لاش کو اٹھا کر یہاں لاؤ، دروازے

پر۔ اور جب وہ آدمی ایک لاش اٹھا کر دروازے پر لاتا تو وہ اسے گاڑی سے باہر دھکا دے دیتے۔ تھوڑی دیر ہی میں سب لاشیں ایک ایک ہمراہی کے ساتھ باہر پھینک دی گئیں۔ اور ڈبوں میں آدمی کم ہو جانے سے ٹانگیں پھیلانے کی جگہ بھی ہو گئی۔

پھر لالہ موسیٰ گذر گیا۔ اور وزیر آباد آگیا۔ وزیر آباد کا مشہور جنکشن، وزیر آباد کا مشہور شہر۔ جہاں ہندوستان بھر کے لیے چھریاں اور چاقو تیار ہوتے ہیں۔ وزیر آباد جہاں ہندو اور مسلمان صدیوں سے بیساکھی کا میلہ بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں اور اس کی خوشیوں میں اکٹھے حصہ لیتے ہیں۔ وزیر آباد کا اسٹیشن لاشوں سے پٹا ہوا تھا، شاید یہ لوگ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے۔ لاشوں کا میلہ، شہر میں دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اور اسٹیشن کے قریب انگریزی بینڈ کی صدا سنائی دے رہی تھی۔ اور ہجوم کی پُرشور تالیوں اور قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ چند منٹوں میں ہجوم اسٹیشن پر آگیا۔ آگے آگے دیہاتی ناچتے گاتے آرہے تھے۔ اور ان کے پیچھے ننگی عورتوں کا ہجوم، مادر زاد ننگی عورتیں، بوڑھی، نوجوان، بچیاں، دادیاں اور پوتیاں، مائیں اور بہوئیں اور بیٹیاں، کنواریاں اور حاملہ عورتیں، ناچتے گاتے ہوئے مردوں کے نرغے میں تھیں۔ عورتیں ہندو اور سکھ تھیں، اور مرد مسلمان تھے۔ اور دونوں نے مل کر یہ عجیب بیساکھی منائی تھی عورتوں کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں پر زخموں کے نشان تھے۔ اور وہ اس طرح سیدھی تن کر چل رہی تھیں جیسے ہزاروں کپڑوں میں ان کے جسم چھپے

ہوں۔ جیسے ان کی روحوں پر سکون آمیز موت کے دبیز سائے چھا گئے ہوں۔ ان کی نگاہوں کا جلال دردیدی کو بھی سرماتا تھا اور ہونٹ دانتوں کے اندر یوں بھینچے ہوئے تھے۔ گویا کسی عیب لاوے کا منہ بند کیے ہوئے ہیں شاید ابھی یہ لاوا پھٹ پڑے گا۔ اور اپنی آتش فشانی سے دُنیا کو جہنم زار بنا دے گا۔

مجمع میں سے آوازیں آئیں۔ "پاکستان زندہ باد"۔

اسلام زندہ باد۔ قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد۔

ناچنے تھرکتے ہوئے قدم پرے ہٹ گئے۔ اور اب یہ عجیب و غریب ہجوم ڈبوں کے عین سامنے تھا۔ ڈبوں میں بیٹھی ہوئی عورتوں نے گھونگھٹ کاڑھ لیے اور ڈبے کی کھڑکیاں یکے بعد دیگرے بند ہونے لگیں۔

بلوچی سپاہیوں نے کہا۔ کھڑکیاں مت بند کرو، ہوا رکتی ہے کھڑکیاں بند ہوتی گئیں۔ بلوچی سپاہیوں نے بندوقیں تان لیں۔ ٹھائیں۔ ٹھائیں۔ پھر بھی کھڑکیاں بند ہوتی گئیں۔ اور پھر ڈبے میں ایک کھڑکی بھی نہ کھلی رہی۔ ہاں کچھ پناہ گزیں ضرور مر گئے۔

ننگی عورتیں پناہ گزینوں کے ساتھ بٹھا دی گئیں۔ اور یہ اسلام زندہ باد اور قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد کے نعروں کے درمیان رخصت ہوئی۔

گاڑی میں بیٹھا ہوا ایک بچہ لڑھکتا لڑھکتا ایک بوڑھی دادی کے پاس چلا گیا۔ اور اس سے پوچھنے لگا ماں تم کہاں سے آئی ہو؟"

دادی نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔ہاں ننھے، آج مجھے میرے وطن کے بیٹوں نے بھائیوں نے نہلایا ہے۔

تمہارے کپڑے کہاں ہیں اماں؟

ان پر میرے سہاگ کے خون کے چھینٹے تھے بیٹا۔ وہ لوگ انھیں دھونے کے لیے لے گئے ہیں۔ دو ننگی لڑکیوں نے گاڑی سے چھلانگ لگا دی اور میں چیختی چلاتی آگے بھاگی۔ اور لاہور پہنچ کر دم لیا۔

مجھے ایک نمبر پلیٹ فارم پر کھڑا کیا گیا۔ نمبر ۲ پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی کھڑی تھی۔ یہ امرتسر سے آئی تھی۔ اور اس میں مسلمان پناہ گزیں بند تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مسلم خدمت گار میرے ڈبوں کی تلاشی لینے لگے ، اور زیور اور نقدی اور دوسرا قیمتی سامان مہاجرین سے لے لیا گیا۔ اس کے بعد چار سو آدمی ڈبوں سے نکال کر اسٹیشن پر کھڑے کیے تھے۔ یہ مذبح کے بکرے تھے۔ کیونکہ ابھی ابھی نمبر ۲ پلیٹ فارم پر جو مسلم مہاجرین کی گاڑی آکر رکی تھی۔ اس میں چار سو مسلمان مسافر کم تھے اور پچاس مسلم عورتیں اغوا کر لی گئی تھیں اس لیے یہاں پر بھی پچاس عورتیں چن چن کر نکال لی گئیں، اور چار سو ہندو مسافروں کو تہ تیغ کیا گیا، تاکہ ہندستان اور پاکستان میں آبادی کا توازن برقرار رہے۔

مسلم خدمت گاروں نے ایک دائرہ بنا رکھا تھا۔ اور چھرے ہاتھ میں تھے۔ اور دائرے میں باری باری ایک مہاجران کے چھرے کی زد میں آتا تھا۔ اور بڑی چابک دستی اور مشاقی سے ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ چند منٹوں میں چار سو آدمی ختم کر دیے گئے۔ اور پھر میں آگے چلی۔ اب مجھے اپنے جسم کے ذرّے ذرّے سے گھن

آنے لگی تھی۔ اس قدر پلید اور متعفن محسوس کر رہی تھی۔ میں جیسے مجھے شیطان نے سیدھا جہنم سے دھکا دے کر پنجاب میں بھیج دیا ہو۔ اٹاری پہونچ کر فضا بدل سی گئی۔ مغلپورہ ہی سے بلوچی سپاہی بدلے گئے تھے۔ اور ان کی جگہ ڈوگروں اور سکھ سپاہیوں نے لے لی تھی۔ لیکن اٹاری پہونچ کر تو مسلمانوں کی اتنی لاشیں ہندو مہاجرین نے دیکھیں کہ ان کے دل فرطِ مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ آزاد ہندستان کی سرحد آگئی تھی۔ ورنہ اتنا حسین منظر کس طرح دیکھنے کو ملتا۔ اور جب میں امرتسر اسٹیشن پر پہونچی تو سکھوں کے نعروں نے زمین آسمان کو گونجا دیا۔ یہاں بھی مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر کے ڈھیر تھے اور ہندو جاٹ اور سکھ اور ڈوگرے ہر ڈبے میں جھانک کر پوچھتے تھے "کوئی شکار ہے" مطلب یہ کہ کوئی مسلمان ہے۔

ایک ڈبے میں چار ہندو براہمن سوار ہوئے۔ سر گھٹا ہوا، لمبی چوٹی۔ رام نام کی دھوتی باندھے، ہردوار کا سفر کر رہے تھے۔ یہاں ہر ڈبے میں آٹھ دس سکھ اور جاٹ بھی بیٹھ گئے۔ یہ لوگ رائفلوں اور بلموں سے مسلح تھے، اور مشرقی پنجاب میں شکار کی تلاش میں جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے دل میں کچھ شبہ سا ہوا۔ اس نے ایک براہمن سے پوچھا۔

براہمن دیوتا کدھر جا رہے ہو؟

ہردوار۔ تیرتھ کرنے۔

"ہردوار جا رہے ہو کہ پاکستان جا رہے ہو؟"

میاں اللہ اللہ کرو۔ دوسرے براہمن کے منھ سے نکلا۔

جاٹ ہنسا۔ تو آؤ اللہ اللہ کریں۔ ادھر مہان شکار مل گیا ہمیں آدھیلا

اللہ بیلی کر ٹیے۔ اتنا کہ کر جاٹ نے بلم نقلی براہمن کے سینے میں مارا۔ دوسرے براہمن بھاگنے لگے۔ جاٹوں نے انھیں پکڑیں۔ ایسے سنیں براہمن دیتا، ذرا ڈاکٹری معائنہ کراتے جاؤ، ہر دوا رجانے سے پہلے ڈاکٹری معائنہ بہت ضروری ہوتا۔

ڈاکٹری معائنے سے مراد یہ تھی کہ وہ لوگ ختنہ دیکھتے تھے۔ اور جس کے ختنہ ہوا ہوتا اسے وہیں مار ڈالتے۔ چار دو مسلمان جو براہمن کا روپ بدل کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے، وہیں مار ڈالے گئے۔ اور میں آگے چلی۔

راستے میں ایک جگہ جنگل میں مجھے کھڑا کر دیا گیا اور مہاجرین اور سپاہی اور جاٹ اور سکھ سب نکل کر جنگل کی طرف بھاگنے لگے۔ میں نے سوچا شاید مسلمانوں کی بہت بڑی فوج ان پر حملہ کرنے کے لیے آ رہی ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ جنگل میں بہت سارے مسلمان مزارع اپنے بیوی بچوں کو لیے چھپے بیٹھے ہیں۔ بری ست اکال اور ہندو دھرم کی جے کے نعروں کی گونج سے جنگل کانپ اٹھا، اور وہ لوگ نرغے میں لے لیے گئے۔ آدھے گھنٹے میں سب صفایا ہو گیا۔ بڈھے، جوان، عورتیں اور بچے سب مار ڈالے گئے۔ ایک جاٹ کے نیزے پر ایک ننھے بچے کی لاش تھی، اور وہ اسے ہوا میں گھما گھما کر کہہ رہا تھا۔ آئی بیساکھی۔ آئی بیساکھی جٹا لائے بنے بنے۔

جالندھر سے ادھر پٹھانوں کا ایک گاؤں تھا۔ یہاں پر گاڑی روک کر لوگ گاؤں میں گھس گئے۔ سپاہی اور مہاجرین اور جاٹ پٹھانوں نے مقابلہ کیا۔ لیکن آخر میں مارے گئے، بچے اور مرد ہلاک ہو گئے تو عورتوں کی باری آئی۔ اور وہیں۔ اسی کھلے میدان میں جہاں گیہوں کے کھلیان لگائے جاتے تھے۔ اور سرسوں کے

پھول مسکراتے تھے، اور عصمت مآب بیبیاں اپنے خاوندوں کی نگاہِ شوق کی تاب نہ لاکر کمزور شاخوں کی طرح جھکی جھکی جاتی تھیں۔ اسی وسیع میدان میں جہاں پنجاب کے دل نے ہیر رانجھے اور سوہنی مہینوال کی لافانی الفت کے ترانے گائے تھے، جہیں شیشم، سرس اور پیپل کے درختوں تلے وقتی چھکلے آباد ہوئے۔ پچاس عورتیں اور پانچ سو خاوند، پچاس ہیریں اور پانچسو قصاب، پچاس سوہنیاں اور پانچسو مہینوال، شاید اب چناب میں کبھی طغیانی نہ آئے گی۔ شاید اب کوئی وارث شاہ کی ہیر نہ گائے گا۔ شاید اب مرزا صاحباں کی داستان الفت و عصمت ان میدانوں میں کبھی نہ گونجے گی۔ لاکھوں بار لعنت ہو ان رہنماؤں پر اور ان کی سات پشتوں پر، جنہوں نے اس خوبصورت پنجاب، اس البیلے پیارے، سنہرے پنجاب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے۔ اور اس کی پاکیزہ روح کو گہنا دیا تھا۔ اور اس کے مضبوط جسم میں نفرت کی پیپ بھر دی تھی، آج پنجاب مر گیا تھا، اس کے نغمے گنگ ہو گئے تھے، اس کے گیت مردہ، اس کی زبان مردہ، اس کا بے باک نڈر بھولا بھالا دل مردہ، اور بنا محسوس کرتے ہوئے اور آنکھ اور کان بند رکھتے ہوئے بھی میں نے پنجاب کی موت دیکھی۔ اور خوف سے اور حیرت سے میرے قدم اس پٹڑی پر رک گئے۔

پٹھان مردوں اور عورتوں کی لاشیں اٹھائے جاٹ اور سکھ اور ڈوگرے اور سرحدی ہندو واپس آئے اور میں آگے چلی۔ آگے ایک نہر آتی تھی ذرا ذرا وقفے کے بعد میں روک دی جاتی، جونہی کوئی ڈبہ نہر کے پل پر سے گزرتا، لاشوں کو عین نیچے نہر کے پانی میں گرا دیا جاتا۔ اس طرح جب ہر ڈبے کے رکنے کے بعد سب لاشیں پانی میں گرا دی گئیں تو لوگوں نے دیسی شراب کی بوتلیں کھولیں اور میں خون اور شراب، اور نفرت کی

بھاپ اگلتی ہوئی آگے بڑھی۔

لدھیانہ پہنچ کر لٹیرے گاڑی سے اُتر گئے اور شہر میں جا کر انھوں نے مسلمانوں کے محلوں کا پتہ ڈھونڈ نکالا۔ اور وہاں حملہ کیا اور لوٹ مار کی اور مال غنیمت اپنے کاندھوں پر لادے ہوئے تین چار گھنٹوں کے بعد اسٹیشن پر واپس آئے، جب تک لوٹ مار نہ ہو چکتی۔ جب تک دس بیس مسلمانوں کا خون نہ ہو چکتا۔ جب تک سب مہاجرین اپنی نفرت کو آلودہ نہ کر لیتے میرا آگے بڑھنا دشوار کیا ناممکن تھا۔ میری روح میں اتنے گھاؤ تھے اور میرے جسم کا ذرہ ذرہ گندے ناپاک خونیوں کے ہاتھوں سے اس طرح رچ گیا تھا کہ مجھے غسل کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس سفر میں کوئی مجھے نہانے نہ دے گا۔

انبالہ اسٹیشن پر رات کے وقت میرے ایک فرسٹ کلاس کے ڈبے میں ایک مسلمان ڈپٹی کمشنر اور اس کے بیوی اور بچے سوار ہوئے۔ اسی ڈبے میں ایک سردار صاحب اور ان کی بیوی بھی تھے، فوجیوں کے پہرے میں مسلمان ڈپٹی کمشنر کو سوار کر دیا گیا اور فوجیوں کو ان کی جان و مال کی سخت تاکید کر دی گئی۔

رات کے دو بجے میں انبالے سے چلی اور دس میل آگے جا کر روک دی گئی، فرسٹ کلاس کا ڈبہ اندر سے بند تھا۔ اس لیے کھڑکی کے شیشے توڑ کر لوگ اندر گھس گئے اور ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو قتل کیا گیا، ڈپٹی کمشنر کی ایک نوجوان لڑکی تھی اور بڑی خوبصورت، وہ کسی کالج میں پڑھتی تھی۔ دو ایک نوجوانوں نے سوچا اسے بچا لیا جائے۔ یہ حسن، یہ رعنائی، یہ تازگی یہ جوانی کسی کے کام آ سکتی ہے۔ اتنا سوچ کر انھوں نے جلدی سے لڑکی اور زیورات کے بکس کو سنبھالا، اور گاڑی سے اُتر کر جنگل

میں چلے گئے۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔

یہاں یہ کانفرنس شروع ہوئی کہ لڑکی کو چھوڑ دیا جائے یا مار دیا جائے۔

لڑکی نے کہا۔ مجھے مارتے کیوں ہو؟ مجھے ہندو کر لو۔ میں تمھارے مذہب میں داخل ہوئی جاتی ہوں۔ تم میں سے کوئی ایک مجھ سے بیاہ کرے میری جان لینے سے کیا فائدہ!

ٹھیک تو کہتی ہے' ایک بولا۔ میرے خیال میں۔

دوسرے نے قطع کلام کرتے ہوئے اور لڑکی کے پیٹ میں چھرا گھونپتے ہوئے کہا۔ میرے خیال میں اسے ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔ جلو گاڑی میں واپس چلو۔ کیا کانفرنس لگا رکھی ہے تم نے۔

لڑکی جنگل میں گھاس کے فرش پر تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ اس کی کتاب اس کے خون سے تر بتر ہو گئی۔ کتاب کا عنوان تھا۔ اشتراکیت عمل اور فلسفہ از جان سٹریچی" وہ ذہین لڑکی ہو گی۔ اس کے دل میں اپنے ملک و قوم کی خدمت کے ارادے ہوں گے۔ اس کی روح میں کسی سے محبت کرنے کسی کو چاہنے۔ کسی کے گلے لگ جانے۔ کسی بچے کو دودھ پلانے کا جذبہ ہو گا۔ وہ لڑکی تھی، وہ ماں تھی، وہ بیوی تھی، وہ محبوبہ تھی۔ وہ کائنات کی تخلیق کا مقدس راز تھی۔ اور اب اس کی لاش جنگل میں پڑی تھی، اور گیدڑ اور گدھ اور کوے اس کی لاش کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔

اشتراکیت۔ فلسفہ اور عمل۔ وحشی درندے انھیں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے اور کوئی نہیں بولتا۔ اور کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ اور کوئی عوام میں سے انقلاب کا

دروازہ نہیں کھولتا۔ اور میں رات کی تاریکی آگ اور شراروں کو چھپاکے آگے بڑھ رہی ہوں۔ اور میرے ڈبوں میں لوگ شراب پی رہے ہیں اور مہاتما گاندھی کے جے کارے بلا رہے ہیں۔

ایک عرصے کے بعد میں بمبئی واپس آئی ہوں، یہاں مجھے نہلا دھلا کر شیڈ میں رکھ دیا گیا ہے۔ میرے ڈبوں میں اب شراب کے بھپارے نہیں ہیں، خون کے چھینٹے نہیں ہیں۔ وحشی خونی قہقہے نہیں ہیں۔ مگر رات کی تنہائی میں جیسے بھوت جاگ اٹھتے ہیں۔ مردہ روحیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ اور زخمیوں کی چیخیں۔ اور عورتوں کے بین اور بچوں کی پکار، ہر طرف فضا میں گونجنے لگتی ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ اب مجھے کبھی کوئی اس سفر پر نہ لے جائے۔ میں اس شیڈ سے باہر نہیں نکلنا چاہتی، میں اس خوفناک سفر پر دوبارہ نہیں جانا چاہتی۔ اب میں اس وقت جاؤں گی۔ جب میرے سفر پر دو طرفہ سنہرے گیہوں کے کھلیان لہرائیں گے اور سرسوں کے پھول جھوم جھوم کر پنجاب کے رسیلے الغت بھرے گیت گائیں گے اور کسان ہندو اور مسلمان دونوں مل کر کھیت کاٹیں گے۔ بیج بوئیں گے۔ ہرے ہرے کھیتوں میں نلائی کریں گے اور ان کے دلوں میں مروت اور آنکھوں میں شرم اور روحوں میں عورت کے لیے پیار اور محبت اور عزت کا جذبہ ہوگا۔

میں لکڑی کی ایک بے جان گاڑی ہوں لیکن پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ اس خون اور گوشت اور نفرت کے بوجھ سے مجھے نہ لادا جائے۔ میں قحط زدہ علاقوں میں اناج ڈھوؤں گی۔ میں کوئلہ اور تیل اور لوہا لے کر کارخانوں میں جاؤں گی۔ میں کسانوں کے لیے نئے ہل اور نئی کھاد مہیا کروں گی۔ میں اپنے ڈبوں میں

کسانوں اور مزدوروں کی خوش حال ٹولیاں لے کر جاؤں گی۔ اور باعصمت عورتوں کی میٹھی نگاہیں اپنے مردوں کا دل ٹٹول رہی ہوں گی۔ اور ان کے آنچلوں میں ننھے منے خوبصورت بچوں کے چہرے کنول کے پھولوں کی طرح نظر آئیں گے۔ اور وہ اس موت کو نہیں بلکہ آنے والی زندگی کو جھک کر سلام کریں گے۔ جب نہ کوئی ہندو ہوگا نہ مسلمان بلکہ سب مزدور ہوں گے اور انسان ہوں گے۔

ہماری مطبوعات

سرگذشت اسیر	سعادت حسن منٹو
گورکی کے افسانے	,,
آتش پارے	,,
منٹو کے ڈرامے	,,
جنازے	,,
تلخ ، ترش ، شیریں	,,
منٹو کے مضامین	,,
سیاہ حاشیے	,,
یزید	,,
پھندے	,,
شکاری عورتیں	,,
دھواں	,,
چغد	,,
بغیر عنوان کے	,,
نور جہاں سرور جہاں	,,

مکتبہ شعر و ادب

سمن آباد - لاہور